# اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل

ترجمہ

## الاسلام و مشکلات الحضارۃ


مصنف : ——— سیّد قطب شہیدؒ

مترجم : ——— ساجد الرحمٰن صدیقی



احباب پبلی کیشنز ۴۳ اے ریٹی گن روڈ لاہور

طابع ——— سلیم احمد فاروقی

ناشر ——— احباب پبلی کیشنز، لاہور

مطبع ——— سندھو پرنٹرز، لاہور

باردوم ——— جنوری ۱۹۷۹ء

تعداد ——— ۱۰۰۰

قیمت ——— ۱۸ روپے

# پیش لفظ

ادارہ معارف اسلامی سید قطب شہید کی دوسری کتاب شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے اس سے قبل المستقبل لہذا الدین کا اردو ترجمہ (اسلام کا روشن مستقبل) علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

ادارہ نے عربی زبان میں، علماء، و مفکرین کی تصنیفات کو اردو داں طبقہ تک پہنچانے کا جو پروگرام بنایا ہے " اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل" اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، سید قطب کی تصانیف کے بارے میں جو فہرستیں ابتک علمی حلقوں کی طرف سے شائع کی جاتی رہی ہیں ان میں اس کتاب کو لاعلمی کے باعث شامل نہیں کیا جاتا رہا، ادارہ معارف اسلامی اس کتاب کو احباب پبلیکیشنز۔ لاہور کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچانے کا شرف حاصل کر رہا ہے — اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام رفیق عزیز ساجد الرحمٰن صدیقی نے انجام دیا ہے، ادارہ کے زیر انتظام انہوں نے قطب برادران کی کئی دیگر تصانیف بھی ترجمہ کی ہیں، اس ترجمہ میں جستہ جستہ ترجمانی سے کام لیا گیا ہے جو اس طرح کی کتاب کے لئے ناگزیر تھا۔

اس کتاب میں سید قطب نے انسانی خصوصیات کو ضرر پہنچانے والی تہذیب کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے — اور خسارہ کے راستے پر بگٹٹ دوڑنے والی انسانیت کو آخری اور خوفناک تباہی سے بچانے کی راہ تجویز کی ہے۔ سید صاحب کے نزدیک حقیقی اسلامی معاشرہ کا قیام ہی واحد راہ نجات ہے، ان کے اپنے الفاظ میں:

> اسلام کے بارے میں ہزاروں تصانیف، مسجدوں اور میدانوں میں سینکڑوں تقریریں دعوت اسلام کیلئے بنائی گئی متعدد فلمیں؟ اور از ہر وغیرہ سے بھیجے جانے والے لاتعداد وفود — یہ تمام کوششیں اور کاوشیں ایک ایسے چھوٹے سے معاشرے کے برابر نہیں ہو سکتیں جو دنیا کے کسی گوشے میں قائم ہو، جس میں اسلام کارفرما ہو اور جو اسلام ہی لئے وجود میں

آیا ہو، جس میں اسلام کی جملہ خصوصیات جلوہ گر ہوں، اور جس میں اسلام زندگی کی عملی شکل میں جلوہ گر ہو"!!

سید شہید کی تمام تصانیف ان کے اسی مشن کا پرتو ہیں جس کی خاطر انہوں نے اس دور میں عزیمت کا بے مثال نمونہ پیش کیا اور شہادت حق کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

امید ہے یہ کتاب قارئین کو مقصد حیات پا لینے اور اس کے لئے تگ و دو کرنے میں مہمیز کا کام دے گی۔

وما علینا الا البلاغ

منور حسن

معتمد اعلیٰ

ادارہ معارف اسلامی

# فہرست مضامین

صفحہ

# انسانیت کی تباہی

آج انسانی زندگی جن خطوط پر گامزن ہے اور تمام ظاہری اندازوں کے مطابق جن خطوط پر وہ آئندہ چلنے والی ہے انسانی زندگی کو ہرگز ہرگز ان خطوط پر نہ چلنا چاہیئے۔ بلکہ زندگی جن اصولوں پر قائم ہے ان میں ایسی بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائی جانی چاہیئں جن کے ذریعہ انسانیت کو تباہی سے اور انسانی خصوصیات کو مٹ جانے سے بچایا جاسکے۔ کیونکہ اگر انسانی خصوصیات ہی مٹ جائیں تو خود انسانیت کی بقا ناممکن ہے۔

زندگی کے موجودہ خطوط کبھی نہ کبھی انسانی خصوصیات کو تباہ کر کے انسان کو مشین اور حیوان بنادیں گے۔ اگرچہ انسانیت ان خطوط پر چلتے ہوئے ابھی انتہا کو نہیں پہنچی ہے۔ اور ابھی تک ایسے آثار پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ جو انسانیت کے انجام کو واضح کرسکیں۔ مگر جو قومیں مادی تہذیب کے عروج کو پہنچ چکی ہیں۔ ان قوموں میں ظاہر ہونے والے آثار بتلاتے ہیں کہ انسانی خصوصیات مضمحل اور پسپا ہوتی جارہی ہیں۔ اور ان کی جگہ مشینی اور حیوانی خصائص ابھرتے جارہے ہیں۔

اس حقیقت سے یہ بات منکشف ہوگئی کہ انسانی زندگی کے موجودہ خطوط کبھی نہ کبھی انسانی خصوصیات کو تباہ کر کے رہیں گے اور اگر انسانیت کے مقدر میں تباہی نہیں لکھدی گئی ہے تو انسانیت کو ان خطوط سے یقیناً ہٹ جانا چاہیئے۔

## اسلامی معاشرہ۔ انسانیت کی ضرورت

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ پوری پوری توقع ہے کہ انسانیت اس المناک انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائے گی اور اللہ کی رحمت سے یہ بھی توقع ہے کہ انسانیت اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ :

سے اور حذر و احتیاط کی پوشیدہ صلاحیتوں کی بناء پر نہ صرف یہ کہ اس المناک انجام سے بچ جائیگی بلکہ مناسب وقت پر اس خطرناک راستے کو چھوڑ کر زندگی کوئی نیا راستہ اختیار کرے گی اور اس ہولناک مصیبت سے چھٹکارا پائیگی جس میں وہ بری طرح پھنسی ہوئی ہے اور جس کے چھوڑ دینے پر اب اسے کوئی اختیار باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ متعدد عوامل نے مل کر اس کی قوت اختیار سلب کرلی ہے!

جب بھی کبھی انسانی زندگی اور انسانی خصوصیات اس قسم کے ہولناک اور تباہ کن حالات کی گرفت میں آئی ہیں تو اکثر یہی ہوا ہے کہ نہایت خفیہ طریقوں اور نامعلوم اسباب کے ذریعہ انسانی زندگی میں تبدیلیاں آئیں اور انسانیت تباہی سے بچ گئی۔ مگر اب حالات کی ہولناکی اور تباہی پہلے سے کہیں زیادہ ہے!

انسانیت کے خطوط میں تبدیلی کے لئے کچھ لوگ مارکسیت (MARXISM) یعنی مادی* جدلیت (DIALECTICAL MATERIALISM) اور تاریخ کی معاشی تعبیر) کا سہارا لیتے ہیں مگر درحقیقت یہ ایک فریب ہے۔ کیونکہ مارکسیت اپنی جدلیاتی مالیت کے ساتھ بذات خود انسانیت کے لئے تباہ کن ہے۔ مارکسیت اپنے فراخ اور آپنے لائحہ عمل کے لحاظ سے انسانیت کے موجودہ خطوط میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو مادی فکر کا عروج اور زندگی کے مشیتی تصوّر کا نقطۂ اختتام ہے!

جس طرح مارکسیت انسانی زندگی کو تباہی سے بچانے میں ناکام ہوچکی ہے۔ اسی طرح انسانیت کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے لئے پیش کئے جانے والے نظریات کا بودا پن بھی واضح ہوچکا ہے۔

درحقیقت یہ تمام افکار سطحی اور جزئی ہیں اور ایسی مصنوعی کوششیں ہیں جن کی انسانی فطرت میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

جب ہم اپنے ماضی اور حال پر نظر ڈالتے ہیں اور مستقبل میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی جو انسانیت کو تباہی سے بچا سکے۔ انسان کو اس تباہ کن مرحلے سے نکال سکے اور انسانی خصوصیات کے تحفظ اور نمو کی ضمانت دے سکے سوائے ایک راہ کے۔ یعنی اسلامی فکر۔

اسلامی منہاج۔ اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ۔

اسی لئے ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کا قیام انسانی اور فطری ضرورت ہے۔ اور اسلامی معاشرہ ایک نہ ایک دن قائم ہو کر رہے گا۔ آج نہیں تو کل سہی۔ ہماری سرزمین پر نہیں کسی اور ملک میں سہی۔

اسلامی معاشرہ ہی اب انسانیت کو، انسانی خصوصیات کو اور انسانی زندگی کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اب انسانی زندگی اسی وقت تباہی سے بچ سکتی ہے جب اس کی انسانی خصوصیات نمو اور ارتقاء کی شکل میں محفوظ رہیں۔

## تہذیب حاضر کے عناصر

موجودہ تہذیب کے زیر سایہ اور انسانی زندگی کے موجودہ خطوط کی بناء پر انسانی خصوصیات کیونکر تباہ ہو رہی ہیں۔ اور انسانیت کس طرح تباہی سے دوچار ہونے والی ہے اور اسلامی معاشرہ کا قیام کیونکر انسانی اور فطری ضرورت بن گیا ہے۔؟

ان سوالات کے جواب دینے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ اس المیہ کے چند اہم عناصر بیان کر دیں۔

۱۔ اگرچہ مادہ اور مادے کو ترقی یافتہ فنی اصولوں کے مطابق مختلف شکلوں میں ڈھالنے کے بارے میں ہمارا علم بڑی وسعت اختیار کر گیا ہے۔ مگر خود انسان کے بارے میں ہم بڑی گمبھیر جہالت میں مبتلا ہیں اور ہم قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ انسان کے لئے کوئی ایسا مکمل اور جامع نظام بنا سکیں۔ جو اس کے تمام پہلوؤں کو محیط ہو جو انسانی طبیعت اور خصوصیات کے مناسب ہو اور جو ان خصوصیات کی نماء اور ترقی کے دوران حفاظت کر سکے اور ان میں باہمی تناسق اور اعتدال برقرار رکھ سکے۔

۲۔ انسانی زندگی اس گمبھیر جہالت پر قائم ہونے کی بناء پر اندھیاروں میں بھٹک رہی ہے کیونکہ انسانیت اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم سے بھٹک گئی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ انسان کی

فطرت اور اس کی خصوصیات سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم انسان کی فطری اور حقیقی ضرورتوں کو پورا کرتی اور انسانی خصوصیات کو نما اور ترقی دیتی ہے یہاں تک کہ انسان زمین پر اللہ کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے! اس کی زندگی نما اور ترقی پا جاتی ہے۔ اور اس کے اندر پنہاں صلاحیتیں اُجاگر ہو کر تعمیر و ترقی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

۳۔ ایک ایسی مادی تہذیب کا وجود جو نہ انسان کے لئے مناسب ہے اور نہ انسانی خصوصیات کو مدنظر رکھتی ہے۔ بلکہ یہ مادی تہذیب انسان کے ساتھ برتاؤ ان پیمانوں سے کرتی ہے جن کو خود اس کی اپنی سائنس اور اپنے علوم نے جنم دیا ہے۔ اور یہ مادی تہذیب انسان کے ساتھ برتاؤ ان حیوانی پیمانوں سے کرتی ہے۔ جن کو خود اس کی جانوروں کے بارے میں تحقیقات نے وجود بخشا ہے!

۴۔ اس تہذیب کے زیادہ تر آثار ان قوموں میں نمایاں ہوئے ہیں جو مادی تہذیب میں عروج حاصل کر چکی ہیں۔ اور مشینی اور حیوانی طریقۂ کار کو بہت بڑی حد تک انسانی زندگی پر منطبق کر چکی ہیں۔ اور ان قوموں نے انسان کی ان اصل اور بنیادی خصوصیات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ جو انسان اور حیوان میں فرق قائم کرتی اور انسان کو مشین سے ممتاز بناتی ہیں۔

—— اور اب ان ترقی یافتہ اقوام ہی میں تباہی کے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔

مندرجہ بالا عناصر کو اگر تھوڑی سی وضاحت سے بیان کیا جائے تو اس المیہ کی صحیح تصویر سامنے آسکتی ہے۔ جس المیہ سے آج انسانیت گزر رہی ہے خواہ اسے اس المیہ کا احساس ہو یا نہ ہو اور اس عظیم مصیبت کی پوری پوری عکاسی ہو سکتی ہے جس کی جانب انسانیت دوڑتی چلی جا رہی ہے —— ساتھ ہی اللہ کی رحمت کاملہ سے یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ اگر انسانیت ندائے فطرت کو سن لے اور اللہ کی پکار پر لبیک کہدے تو وہ اس المناک انجام سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

---

# "انسان نامعلوم"

مندرجہ بالا عنوان ہمارا مقرر کیا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک امریکی سائنسداں کی اختراع ہے اور تہذیب جدید کے سائنسداں اپنے علمی مرتبہ۔ اپنے جدید ترین نظریات اور اپنی تحقیقات میں ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں!!

یہ الکسیس[1] کاریل کی ایک مشہور تصنیف کا نام ہے۔

مصنف خود مقدمۂ کتاب میں اپنے اور اپنی کتاب کے بارے میں تعارف کراتا ہے۔ ہم اس تعارف کا ایک بڑا حصہ یہاں نقل کر رہے ہیں۔ تاکہ جس استدلال کی جانب ہم اشارہ کر رہے ہیں اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہو سکے۔ پھر ہم انسان کے بارے میں انسان کی جہالت سے متعلق اس عظیم سائنسدان کے اقوال نقل کریں گے۔

## سائنسداں کی گواہی

"میں فلسفی نہیں ہوں بلکہ صرف سائنسدان ہوں۔ میں نے زندگی کا بڑا حصہ تجربہ گاہ میں گزارا ہے۔ جہاں میں جاندار کائنات کا مطالعہ کرتا رہا اور زندگی کا باقی حصہ میں نے انسانوں کے ساتھ چلتے پھرتے گزارا ہے۔ اور اس عرصہ میں بنی نوع انسان

---

[1] ڈاکٹر الکسیس کاریل (CARREL 1873-1944) فرانس کے شہر لیون میں پیدا ہوئے۔ لیون سے ڈاکٹری اور دیجون سے سائنسی علوم میں ڈگری لی۔ کئی سال تک دیجون یونیورسٹی میں تدریس کے بعد امریکہ چلے گئے اور نیویارک کے روکفلر انسٹیٹیوٹ میں علمی تحقیقات میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تقریباً تیس سال تک کام کرنے کے بعد سنہ ۱۹۳۹ء میں علیحدہ ہوئے اور فرانسیسی وزارت صحت میں جنگ سے متعلق ایک مہم پر فائز کئے گئے۔ یہ مہم دراصل ان کی پہلی عالمگیر جنگ کے موقعہ پر انجام دی گئی خدمات کا تکملہ تھی۔ جبکہ انہوں نے فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی افواج میں ایک جراح کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ آپ کو گرانقدر طبی خدمات کے صلہ میں ۱۹۱۲ء میں نوبل پرائز دیا گیا۔

کا مطالعہ کیا اور انہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں علمی دائرۂ کار سے باہر رہ کر بھی مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہوں۔"

"میں بغیر کسی تعریف و توصیف کے اس کتاب کی خوبیاں واضح کئے دیتا ہوں اور ساتھ ہی جو اسو نا معلوم ہیں ان کا بھی اعتراف کرتا ہوں

"میں بھی انسان کو تجربات اور مطالعہ کا ملحض خیال کرتا ہوں۔ مگر یہاں میں نے وہی کچھ بیان کیا ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یا جو کچھ براہِ راست میں نے اپنے ملنے والوں سے سیکھا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بغیر کسی کوشش کے اور بغیر تمنائے ستائش کے زندگی کے مظاہر اور ان کی خوفناک پیچیدگیوں پر درس دینے کا موقع ملا۔ چنانچہ میں نے عملی شکل میں انسانی دلچسپیوں کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا۔ میں نے ان تمام امور میں غور کیا جن میں دولتمند اور فقیر، صحت مند اور بیمار، تعلیم یافتہ اور جاہل، ضعیف العقل اور مجنوں۔ زیرک اور مجرم۔ غرض تمام لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی طرح میں نے مزدور اور کسان۔ لکھنے والے اور تاجر، سرمایہ دار اور مل مالکان، سیاستدان اور اربابِ حکومت، عسکری اور جامعات کے اساتذہ۔ مدرس اور اہلِ مذہب۔ بورژوائی اور ارستقراطی لوگوں کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔

میرے راستے میں فلسفی اور فنکار، شعراء اور علماء، جینئس اور مقدس لوگ بھی آئے۔۔۔۔ اور میں نے رگوں کی گہرائیوں اور دماغ کی پیچیدگیوں کا گہرا مطالعہ کیا جو درحقیقت عضویاتی اور عقلی مظاہر کی اصل بنیادیں ہیں۔

میرا اصل سرمایہ دورِ جدید کے علوم ہیں۔ انہی علوم کے ذریعے میں نے زندگی کا مشاہدہ کیا اور انہی کے ذریعے میری توجہ ایک ہی وقت میں کئی موضوعات کی جانب مبذول ہو سکی۔۔۔۔ میں نے درحقیقت قدیم و جدید دونوں دنیاؤں کا باشی ہوں۔۔۔۔ میں اس وجہ سے بھی ممتاز ہوں کہ میں نے خاصا وقت راک فیلر انسٹی ٹیوٹ میں ان علماء کے ساتھ گذارا ہے جن کو سیمون فلکسنر نے جمع کیا تھا۔۔۔۔ میں نے وہاں زندگی کے مظاہر میں غور و فکر کیا جبکہ ملتسز، جاک لوئیب اور نگوشی

جیسے بے مثال اہلِ علم نے زندگی کی گتھیوں کو سلجھایا۔ چونکہ قلندر بڑا عبقری اور نابغہ تھا۔ اس لئے زندہ کائنات کا مطالعہ بے مثال وسعت نظری سے کیا گیا۔ چنانچہ انسٹیٹیوٹ کی ہر تجربہ گاہ میں انسان کی صنعت سے مادّے کی ارتقاء اور تغیّر کو زیرِ بحث لایا گیا اور مادہ کے بارے میں تحقیقات کی گئیں۔

## انسان کا سائنسی مطالعہ

ایکس ریز (X. RAYS) کی مدد سے ماہرین طبیعات نے ان انسانی نسوں کے مواد کے اجزاء کا پتہ لگایا جو سادہ اور غیر پیچیدہ ہیں۔ یعنی یہ مواد ایک طرح سے ان جزئیات کی ترکیب میں داخل ہونے والے ذرّات کے درمیان وسیع تر تعلقات کا ذریعہ ہیں۔ ماہرین کیمیا اور طبیعات نے جسم کے اندر پائے جانے والے پیچیدہ مواد کی تحلیل کی۔ جیسے خون کے ہیموگلوبی ذرات نسوں کی پروٹینی ذرات جسم کی اخلاط، جسم کا وہ ابال جس کی بناء پر ذرات منقسم ہوتے ہیں۔ اور ان ذرات سے اس عظیم جثّہ کا وجود میں آجانا۔

کچھ کیمیا داں ایسے بھی ہیں جنہوں نے جزئیات کی ترتیب ہی پر غور نہیں کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے ان ترکیبات کے جسم کی رطوبتوں میں شامل ہو جانے کے بعد ایک دوسرے سے تعلق پر بھی غور کیا ہے۔ یا یہ کہیئے کہ ان کیمیا دانوں نے اس طبعی اور کیمیائی توازن کا مطالعہ کیا جو خون ناب (BLOOD SERUM) کو محفوظ رکھتا ہے۔ حالانکہ نسوں پر مستقل تغیرات آتے رہتے ہیں۔

اسی طرح عضویاتی منظر کے کیمیائی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ کیونکہ علم وظائف اعضاء کے ماہرین۔ مختلف علوم سے مدد لیتے ہوئے۔ جزئیات کے مجموعہ اور ترتیب کے نتیجہ میں رونما ہونے والی بڑی بڑی ترکیبات، نسوں اور خون کے خلیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ زندگی کے مادے پر غور کرتے ہیں۔ یہ ماہرین ان خلیوں پر تجربات کرتے ہیں۔ ان کی وجوہ اتحاد تلاش کرتے ہیں اور ان قوانین کا پتہ لگاتے ہیں جن کے تحت یہ خلیے اپنے گرد و پیش کی اشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز مرکز کائنات کی اس مجموعہ پر اور کیمیاوی مواد کی نسوں اور شعور پر تاثیر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

کچھ ماہرین نے اپنی تحقیقات وائرس (VIRUS) اور بکٹیریا (BACTERIA) تک محدود رکھیں۔ کیونکہ ہمارا متعدی امراض سے دوچار ہونا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ہمارے خون میں موجود ہیں

اسی طرح وہ عجیب وسائل جن کے ذریعہ جسم ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسی طرح مہلک امراض سرطان امراضِ قلب اور دردِ گردہ۔

انفرادی مشکل اور اس کی کیمیاوی بنیادیں کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہیں۔

اِن مباحث میں ماہر بڑے بڑے لوگوں کی تحقیقات اور ان کے تجربات کے نتائج معلوم کرنے کے مجھے بڑے نادر مواقع میسر آئے ہیں۔ . . ہمارے نظام جسم، زندہ کائنات کے خواص اور ہمارے جسم و عقل کے تناسق میں جامد مادہ جو عمل کرتا ہے اس سے بخوبی واقف ہوں۔ اور یہ تمام باتیں میرے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔

غرض میں نے علم جراحت سے لے کر خلیہ کی فزیالوجی اور مابعد الطبیعیات تک مختلف اور متنوع مضامین کا مطالعہ کیا ہے۔

ان سہولتوں کی بناء پر جو پہلی مرتبہ سائنس کو میسر آئی ہیں۔ سائنس اس قابل ہے کہ اپنا فرض ادا کر سکے۔" (ص ۵ ـ ۸)

## انسان کی حقیقت سے ناواقفیت

یہ شخص جو ان تمام سائنسی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جو انسان کے بارے میں تمام مباحث کے نتائج سے واقف ہے۔ وہی اس کے بعد "انسان نامعلوم" نامی کتاب تصنیف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کے بارے میں ہمارا علم نہ ہونے کے درجہ میں ہے اور در حقیقت انسان کے بارے میں ہم بڑی گھمبیر جہالت میں مبتلا ہیں۔

مصنفؒ کی زبانی سنئے:

"علومِ جمادات اور علومِ حیات میں بڑا عجیب فرق ہے۔ چنانچہ فلکیات، میکانکس اور طبیعیات سے متعلق بالکل ٹھیک ٹھاک اور نہایت درستگی کے ساتھ خالص حسابی زبان میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ ان علوم کی وجہ سے ایک ایسی پیوست اور متناسق دنیا بن گئی ہے۔ جیسے یونان کے ان قدیم آثار! ان علوم نے دنیا کے گرد اعداد و شمار اور نظریات کا ایک جال سا بُن دیا ہے۔

جبکہ علوم حیات میں صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ یہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کا مطالعہ کرنے والے درختوں کے جھنڈ یا کسی ایسے جادوئی جنگل میں پھنس کررہ گئے ہیں جہاں درختوں کی کثرت ہر علامت اور نشانی کو مٹا دیتی ہے۔

ماہرین حیاتیات حقائق کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں بیان تو کرسکتے ہیں مگر دو اور دو چار کی طرح ثابت نہیں کرسکتے۔

جن مادی اشیاء کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، خواہ وہ ذرات ہوں یا ستارے، چٹانیں ہوں یا بادل ٹھوس ہوں یا مائع ..... ہم ان تمام مادی اشیاء کے ثقل اور ابعاد وغیرہ پر مشتمل خواص معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ نتائج کوئی بلند حقائق نہیں ہیں بلکہ علمی فکر کا مواد ہیں ..... اشیاء کا مطالعہ ہمیں صرف صورت وصفی کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ علم وصفی ظواہر ہی کو ترتیب دیتا ہے نا قابل تغیر کمیات کے درمیان نا قابل تغیر روابط (قوانین طبیعت) اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب سائنس کسی قدر معنویت اختیار کرلے۔ طبیعت اور کیمیا کی عظیم اور سریع ترقی بھی اسی وجہ سے ہے کہ یہ دونوں معنوی اور کمی علوم ہیں۔ یہ علوم اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انہوں نے طبیعت اشیاء سے بالکل پردے اٹھا دیئے ہیں۔ بلکہ یہ علوم مستقبل میں آنے والے واقعات کے بارے میں پیش گوئی میں مدد دیتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ کیونکر ان واقعات کو ہم اپنی منشا اور مرضی کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ درحقیقت مادہ کی ترکیب کے راز اور اس کے خواص معلوم کرکے ہم روئے زمین پر موجود ہر شے کے مالک بن گئے ہیں، بسوائے اپنے آپ کے....

مگر زندہ کائنات کے بارے میں بالعموم اور انسان کے بارے میں بالخصوص یہ ترقی حاصل نہ ہوسکی۔ بلکہ انسان اب بھی وصفی مرحلہ میں ہے ___ کیونکہ انسان ایک ایسی کل ہے جس کے اجزا انہیں ہوسکتے۔ اور کل بھی ایسی پیچیدہ کہ کسی عرضِ بسیط تک رسائی آسان نہیں ہے۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ انسان مجموعی حیثیت میں یا اس کے اجزاء ایک ہی وقت میں سمجھ میں آسکیں جیسا کہ انسان کے خارجی علائق بھی نا قابل فہم ہیں۔

ہمیں اپنی تحلیل نفسی کے لئے مختلف فنون اور متعدد علوم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حالانکہ یہ علوم ایک مشترک مقصد میں بھی مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان علوم کے پاس جس قدر وسائل ہیں وہ اسی کے بقدر اس سے چند امور اخذ کر لیتے ہیں۔ اگر ان امور کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو ان میں سے کم ہی حقیقت بننے کے قابل ہوں گے۔ اور انسانی وجود کے بارے میں اس قدر حصہ نامعلوم رہ جائے گا کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تشریح (DISSECTION) کیمیاء، فزیالوجی، نفسیات، فن تعلیم، تاریخ، اجتماعیات اور سیاسی معاشیات۔ یہ تمام علوم اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کو بیان نہیں کرتے۔

## انسان کے بارے میں ماہرین کی اپنی اپنی رائے

ماہرین کے نزدیک انسان جامد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا بیابانی نقش ہے جو مختلف علوم کے نقوش سے تشکیل پاتا ہے۔ چنانچہ انسان ایک جسم ہے جس کی ماہرین حیاتیات تشریح کرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات اور روحانی زندگی کے معلمین کے خیال میں انسان شعور کا نام ہے۔ باطنی غور و فکر کہتا ہے کہ انسانی وجود کی گہرائیوں میں شخصیت پوشیدہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ انسان کیمیاوی مواد کا نام ہے۔ جس سے ہماری نسیں اور جسم کے اخلاط بنتے ہیں۔ ماہرین عضویات نے عضویاتی قوانین کا مطالعہ کر کے بتایا کہ انسان خلیوں اور غذائی رطوبتوں کا مجموعہ ہے۔ علمائے صحت کے خیال میں انسان نسوں اور شعور کا آمیزہ ہے۔ اور انسان کو زمانے کے ساتھ ساتھ ارتقاء کرتے ہوئے صحت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنا چاہئیں۔ کسی کے خیال میں انسان دنیا میں ایک ایسا وجود ہے جسے بس کارخانوں کی مصنوعات استعمال کرنے سے فرصت نہیں اور جن مشینوں کا وہ غلام بن چکا ہے وہ اسی طرح چلتی رہیں گی ۔ مگر انسان شاعر بھی ہوتا ہے۔ ہیرو بھی بنتا ہے اور مقدس بھی ہو جاتا ہے۔ انسان فقط ایک انتہائی پیچیدہ مخلوق نہیں جس کو ہمارے علوم و فنون حل کرتے ہیں۔ مگر انسان میلانات معنیات اور انسانی بلندیوں کا مجموعہ بھی ہے۔

انسان کے بارے میں ہماری تمام آراء کا سرچشمہ عقلی فلسفہ ہے۔ اور ان تمام آراء کی بنیاد سطحی

معلومات ہیں۔ پھر ان آراء میں سے جو ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اپنے فراخ کے مطابق منتخب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے بارے میں ہمارا تصور ہمارے احساسات اور معتقدات کے مطابق ہوتا ہے ایک مادیت پرست اور ایک روحانیت پرست انسان کلورائیڈ (CHLORIDE) کی تعریف پر تو اتفاق کر سکتے ہیں مگر انسان کے بارے میں متفق نہیں ہو سکتے۔

وظائف اعضاء کا ایک ماہر جو جسم کے میکانکی اعمال پر بحث کرتا ہے اور وہ ماہر جو خود مذہب زندگی پر بحث کرتا ہے انسانی جسم کے بارے میں دونوں کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے۔

غرض جو انسان جیک ویب کی نظر میں ہے وہ اس انسان سے قطعاً مختلف ہے جو ہانز اور زلیش کی نظر میں ہے۔

نوع انسانی نے اپنا تعارف حاصل کرنے کے لئے کافی کوششیں کی ہیں مگر باوجود یکہ ہمارے پاس ایک وسیع ذخیرہ ان آراء کا موجود ہے جو ہر دور میں علماء فلاسفہ شعراء اور روحانی لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ پھر بھی ہم اپنے نفس کے صرف چند پہلوؤں سے واقف ہیں۔ ہم انسان کو ایک کل کی حیثیت سے سمجھنے کی بجائے اس کے مختلف اجزا کو سمجھتے ہیں اور یہ اجزا بھی ہمارے وسائل کے تراشے ہوئے ہیں۔ گویا ہم چند سایوں کے پیچھے لپک رہے ہیں۔ جن کے دامن میں ایک نا معلوم حقیقت پنہاں ہے۔!!

## سائنسی تحقیق کے باوجود علم ناقص

فی الحقیقت ہم بڑی گمبھیر جہالت میں مبتلا ہیں۔ نوع انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے جو عام سے سوالات آتے ہیں ان کا بھی کوئی جواب نہیں مل پاتا۔ کیونکہ ہماری باطنی دنیا کے لامحدود پہلو ابھی تک نامعلوم ہیں۔ ہم ابھی تک اس قسم کے متعدد سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

مرکب اور وقتی خلیوں کے اعضاء بنانے والے کیمیائی مواد کے اجزا کیونکر متحد ہوتے ہیں؟

ناقلات وراثت، حامل بیضہ میں اس بیضہ سے مشتق ہونے والے فرد کی صفات کو کیونکر جاگزیں کرتے ہیں؟

خلیے کس طرح خود بہ خود جمع ہو کر نسیں اور اعضا بن جاتے ہیں؟ کیونکہ خلیوں کو بھی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح پہلے سے معلوم ہے کہ انہیں کیا کردار ادا کرنا ہے اور جسم بسیط اور پیچیدہ کی تشکیل کے پوشیدہ میکانکی عمل میں کس طرح مدد دیتا ہے۔

نفسیاتی اور فزیالوجیائی حیثیت سے ہمارا انگوٹی مزاج کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نسوں، اعضا مائعات اور شعور سے مرکب ہیں۔ مگر شعور اور روح کے درمیانی علائق ابھی تک ناقابل فہم گتھیاں ہیں۔

ہمیں عصبی خلیوں کی فزیالوجی کے بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ارادہ کس حد تک جسم پر اثر انداز ہوتا ہے؟ عقل اعضاء کی حالت سے کیوں کر متاثر ہوتی ہے؟ عضوی اور عقلی خصوصیات جو ہر فرد کو وراثت میں ملتی ہیں۔ کس طرح زندگی کے طریقہ کار، کھانے اور آب وہوا میں موجود کیمیائی اجزاء اور نفسیاتی اور ادبی نظام کے بدل جانے سے بدل جاتی ہیں۔

ہمیں اب تک یہ علم نہیں ہے کہ جسم انسانی، عضلات اور اعضا میں اور عقلی و روحانی اعمال میں تعلق کی ماہیت کیا ہے؟ ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں۔ جو اعصابی توازن تکان کے مقابلہ کی قوت اور امراض کے خلاف قوت دفاع پیدا کرتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ادبی ذوق، قوتِ فیصلہ اور جرأت میں کیونکر اضافہ ہو سکتا ہے۔ عقلی ادبی اور مذہبی اعمال میں نسبتی اہمیت کیا ہے؟

عمل کی کونسی شکل شعور اور خیالات کی ذمہ دار قرار دی جا سکتی ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فزیالوجی اور عقلی عوامل ہی ہیں جو خوش بختی اور بدبختی اور کامیابی اور ناکامی کے اسباب بنتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ عوامل کیا ہیں۔ ہم کسی شخص کو مصنوعی طریقہ پر قبولیت سعادت کی صلاحیت فراہم نہیں کر سکتے۔

ہمیں اب تک یہ علم نہیں ہے کہ کس قسم کے ماحول میں ایک متمدن اور ترقی پذیر انسان پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوشش اور جدوجہد کی روح کو کچل دیا جائے اور ہر ایسی شے کو ختم کر دیا

جائے جس سے ہم اپنی فزیالوجی اور روحانی ہیئت کی بنا، پر تکلیف محسوس کرتے ہیں۔؟

کیا ہم تہذیب جدید میں انسان کے تنزل اور انحطاط کو روک سکتے ہیں؟

کتنے ہی سوالات ہیں جو نہایت اہمیت کے حامل موضوعات میں اٹھائے جاتے ہیں۔ اور جن کا کوئی جواب ابھی تک نہیں دیا جاسکا۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ انسان سے متعلق سائنسدانوں کی جملہ تحقیقات قطعاً ناکافی ہیں اور انسان کے بارے میں ہماری معلومات اب تک ابتدائی ہیں (ص ۱۴-۱۸)

## حقیقت انسان سے ناواقفیت کے اسباب

مگر سوال یہ ہے کہ حقیقت انسان کے بارے میں ہم اس قدر عظیم جہالت میں کیوں مبتلا ہیں؟ یہ حقیقت اس قدر پردوں میں پنہاں کیوں ہے کہ ہم اسے پوری طرح دیکھ نہیں پاتے؟ مطالعۂ حیات میں مصروف لوگ درختوں کے جھنڈ اور جادوئی جنگل میں گم کردہ راہ کیوں ہو گئے، کہ انہیں درختوں کی کثرت کی بنا، پر کوئی علامت اور نشانی تک نظر نہیں آتی؟

کیا یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ کسی وقت ہمارے علمی وسائل محدود رہے ہیں؟ یا یہ صرف انسانی زندگی کے حالات کا تقاضا ہے۔ اور اس امر کی قوی امید ہے کہ ہم اپنے وسائل میں اضافہ کر کے اور ان حالات کو بدل کر انسان کی واضح، اور مکمل حقیقت تک رسائی حاصل کرلیں گے؟

یا اس صورت حال کے ذمہ دار وہ اسباب ہیں جو حقیقت انسانی کی طبیعت اور ہماری فکر و عقل کے مزاج میں پنہاں ہیں۔ جن کی بنا، پر مادی دنیا جیسی وضاحت اور باریکی کے ساتھ انسانی حقیقت تک رسائی دشوار ہو گئی ہے۔؟

یہ عظیم سائنسدان ان تمام اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے راستہ میں حائل ہونے والے دوسری قسم کے اسباب کے ختم ہو جانے کی کوئی امید نہیں ہے۔

یہ بات وہ سائنسدان بتاتا ہے جس نے حقیقت کا مطالعہ کیا ہے اور جو سائنس کی طاقت

اور اس کی جولان گاہ سے واقف ہے۔

اگرچہ اس سائنسدان کے اقتباسات طویل ہوتے جارہے ہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس خاص نقطہ پر اسے اس کے مخصوص انداز میں گفتگو کرنے دیں۔ البتہ ہم اس کے نقطہ نظر کی کسی موقعہ پر موافقت کریں گے اور کسی موقعہ پر مخالفت بھی کریں گے!

"ہم جہاں اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ زندگی سے ناواقف ہیں۔ وہاں ہم اپنی پیچیدہ طبیعت اور اپنی ترکیب عقلی سے بھی ناواقف ہیں۔

کچھ بھی ہو۔ بہرحال انسان کو زندہ رہنا تھا۔ اور زندہ رہنے کی اس ضرورت نے اسے مجبور کیا کہ وہ خارجی دنیا کو اپنے قبضہ میں لے لے۔ تو جہاں انسان کے لئے غذا اور مکان کا حصول ضروری تھا وہاں انسان کے لئے یہ بھی ضروری ہوگیا کہ وہ جنگلی جانوروں اور اپنے دشمن انسانوں سے مقابلہ کرے۔۔۔

طویل زمانے گزرنے کے باوجود ہمارے آباؤ اجداد کو نہ تو اتنی فرصت میسر آئی اور نہ ان میں یہ شعور بیدار ہوا کہ وہ اپنے نفوس کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی عقلوں کو اسلحہ اور سامان بنانے، آگ کی دریافت گھوڑوں اور جانوروں کی تربیت، سواریوں کی ایجاد اور کاشتکاری میں لگایا ہوا تھا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی عقل اور اپنے جسم کے بارے میں سوچتے۔ انہوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کو چاند سورج، ستارے، سیلابوں اور موسموں پر مرتکز کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جس وقت فزیالوجی قطعاً غیر معروف تھی اس وقت فلکیات خاصی ترقی کر چکا تھا۔ اور گیلیلیو مرکز کائنات یعنی زمین کو سورج کا حقیر سا تابع بتا چکا تھا جب کہ اس وقت تک اس کے معاصرین نے عقل، جگر اور غدہ درقیہ (THYROID GLAND) کے بارے میں کوئی ابتدائی فکر بھی پیش نہیں کی تھی۔

چونکہ طبعی احوال میں انسانی جسم اپنے وظائف بخیر و خوبی انجام دیتا رہتا ہے اور اس کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے اس لئے سائنس بھی اسی طرف متوجہ ہوگئی جس کی انسان معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا یعنی خارجی دنیا۔"

لاکھوں انسان جو اس دنیا میں آئے ان میں چند ایسے بھی تھے جنہیں ——

طبیعت[۱] نے بڑی نادر اور حیرت انگیز صلاحیتیں بخشیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اشیاء نامعلوم کا ادراک کیا، اپنے خیالات سے نئی دنیاؤں کو جنم دیا اور مبین مظاہر میں موجود پوشیدہ تالیوں سے پردے اٹھائے۔

ان سائنس والوں نے بسیط ترکیب والی مادی دنیا کو دریافت کیا اور جلد ہی مادی دنیا سائنسدانوں کی جولاں گاہ بن گئی۔ اور اس دنیا کے مخصوص قوانین کے ایسے راز ہائے سربستہ منکشف ہو گئے جن کی بدولت ہم نے مادے کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کیا۔

عملی اکتشافات کی عملی تطبیق نے ان لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا جو ان کو خوب تر بناتے رہے اور انھیں ترقی دیتے رہے اور مجموعی حیثیت سے پوری انسانی زندگی کو فائدہ پہنچا۔ اور ان ایجادات سے عوام بڑے خوش ہوئے۔ کیونکہ ان ایجادات سے ان کی راحت و آرام میں اضافہ ہو گیا۔

کسی شخص کو ان ایجادات سے اس قدر دلچسپی نہیں ہے جن سے ہمارے جسم اور ہمارے احساسات پر کوئی روشنی پڑتی ہو جس قدر اسے ان ایجادات سے دلچسپی ہے۔ جو لوگوں کی محنت و مشقت میں تخفیف اور مزدور کے بوجھ کو ہلکا کریں۔ اور جن سے رسل و رسائل میں سرعت آئے اور زندگی کی سختی نرمی سے بدل جائے۔ اس طرح مادی دنیا پر بالادستی[۲] کے اہتمام اور ارادے کی بناء پر انسان عضویاتی

---

[۱] حالانکہ یہ صاحب (الکسیس کاریل) علمی میدان میں مشاہدۂ حقیقت کی بناء پر اللہ کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی وراثت اور گہرے ثقافتی اثرات کی بناء پر صلاحیتوں کی بخشش طبیعت کی جانب منسوب کر رہا ہے جبکہ دین کی نظر میں یہ تعبیر بے معنی ہے۔ کیونکہ بخشنے والا اللہ ہے اور طبیعت یعنی کائنات بذات خود اللہ کی مخلوق ہے اور بخشش یا تخلیق پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ طبیعت الٰہ نہیں ہے۔ اور چونکہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے اور نہ کوئی بخشنے والا۔

[۲] "بالادستی" کی تعبیر بھی مغربی عقل کا ایک مظہر ہے۔ اسی تصور کی جڑیں یونانی اور رومی دیومالا میں پیوست ہیں اور اسے سامراجی یورپ کا فلسفہ طاقت غذا دے رہا ہے۔ کیونکہ مغربی فکر کے لحاظ سے تعلق صرف "بالادست" اور "مجبور" کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں مفاہمت اور صداقت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر اسلامی تصور میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے تابع کر دیا ہے اور انسان تو اس میں کائنات معلوم کر کے اللہ کے حکم سے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اور روحانی دنیا کو فراموش کر بیٹھا۔

## نفس کی معرفت

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اپنے گرد و پیش کی معرفت بھی انتہائی ضروری ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی طبیعت کی معرفت کو کم اہمیت دیں۔ اس کے باوجود مرض والم اور موت اور کسی قدر اس مخفی قوت نے جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتی ہے۔ ان تمام امور نے کسی درجہ میں بنی نوع انسان کی توجہ کسی نہ کسی درجہ میں اپنی عقل اور اپنے جسم کی جانب مبذول کرائی۔

طب نے بظاہر عملی شکل ہی پر قناعت کر لی کہ نسخے لکھ کر انسان کو بیماریوں سے شفایاب کرتی رہے۔ مگر آخر کار طب نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ مرض سے بچاؤ اور شفا کا صحیح طریقہ طبعی جسم اور بیمار جسم کو پوری پوری طرح سمجھنا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ علوم وضع کئے جائیں جو آج علم تشریح، علم کیمیا، علم وظائف اعضاء اور علم امراض کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔

ہمارے اسلاف کے نزدیک اپنے جسموں کی گتھیاں سلجھانا، ادبی مشاغل، مجہول کے جاننے کی خواہش اور ماوراء مادہ کا علم بدنی آلام اور امراض سے زیادہ اہمیت کے حامل رہے۔ اسی لئے بڑے بڑے لوگوں کی نظریں طب کی جانب جانے کی بجائے روحانی زندگی اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ چنانچہ وظائف اعضاء کا علم ہونے سے پہلے قوانین تصوف وجود میں آ گئے۔ مگر یہ قوانین ان فرصت کے لمحات میں پیدا ہوئے جب انسان کی نظر کچھ دیر کے لئے خارجی دنیا پر بالادستی کی جدوجہد سے ہٹ کر دوسرے امور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

انسان اپنے نفس کی معرفت کی جانب جو دیر سے متوجہ ہوا ہے اس کا ایک سبب اور بھی ہے وہ یہ کہ ہماری ترکیب عقلی البسیط حقائق کے بارے میں فکر کے وقت ہمیں مسرت بخشتی ہے۔ کیونکہ ہم زندہ کائنات اور انسان جیسی پیچیدہ شکل کے حل میں الجھن سی محسوس کرتے ہیں۔ بقول برگساں[1] عقل زندگی کے فہم سے طبعی

---

[1] ہنری برگساں (HENRI BERGSON 1859-1941) مشہور فرانسیسی فلسفی ہے ۱۹۰۰ء میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں فرنچ اکاڈمی کا رکن مقرر ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں فلسفیانہ تحریرات پر ادبیات کا نوبل پرائز پایا۔ ثنویت کا قائل ہے یعنی عالم میں دو برسرپیکار قوتیں ہیں۔ زندگی اور مادہ۔ زندگی ہمیشہ رواں دواں رہنے والی ایک فعال قوت ہے۔ جو بیک وقت مادے کے اندر اور مادہ کے ماوراء رہ کر گہرائی لطافت تنوع اور پیچیدگی کے لئے تڑپتی ہے۔ (س۔ صدیقی)

طور پر عاجز ہے... اس کے برعکس ہم چاہتے ہیں کہ ساری دنیا میں ان ہندسی اشکال کو تلاش کریں جو ہمارے شعور کی گہرائیوں میں موجود ہیں...... ہمارے وجود میں ابھرنے والی دقیق نسبتیں اور ہمارے آلات کا اتقان ہماری عقل کی اساسی صفت کی تعبیر ہیں.... ہندسہ ہماری دنیا میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہماری اپنی تخلیق ہے۔ کیونکہ طبعی وسائل میں اس قدر دقت اور باریکی نہیں ہوسکتی جس قدر کہ ہمارے اپنے وسائل میں ہے۔ ہمیں دنیا میں وہ وضاحت اور دقت کہیں نظر نہیں آتی جو ہماری فکر میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے ہم مظاہر کی پیچیدگی سے بعض ایسے بسیط نظام اخذ کر لیتے ہیں جن میں ایسے عناصر موجود ہوں جن کے آپس میں معین روابط ہوں اور جنھیں بالکل حسابی انداز سے بیان کیا جاسکے۔ اخذ کی یہ صلاحیت جس سے انسانیت فائدہ اٹھارہی ہے۔ یہی اس عظیم ترقی کی ضامن ہے جو ماہرین طبیعیات اور کیمیا کے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے۔

زندہ کائنات کے طبعی اور کیمیائی مطالعہ کو یکساں طور پر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور زندہ کائنات اور عالم جمادات میں طبیعت اور کیمیا کے قوانین مماثل ہیں۔ (جیسا کہ بہت پہلے کلاڈ برناد کہہ چکا ہے) مندرجہ بالا حقیقت علم وظائف اعضاء کی اس دریافت کو واضح کرتی ہے کہ خون کی الکلی (ALKALI) اور سمندر کا پانی مماثل قوانین کے تابع ہیں۔ اور سکڑے ہوئے عضلات سے صادر ہونے والے اعمال ؟۔

زندہ کائنات کے طبعی اور کیمیائی پہلوؤں کی تلاش آسان ہے جس طرح یہ پہلو مادی دنیا کی دوسری موجود اشیاء میں ہیں... علم وظائف اسی مہم کی تحقیق میں کامیاب ہوا ہے۔

حقیقی فزیالوجی مظاہر ـ یعنی وہ مظاہر جو انسان کی تنظیم کے نتیجہ میں سامنے آتے ہیں۔ کے مطالعہ کے راستے میں کافی اہم رکاوٹیں ہیں۔ کیونکہ جن اشیاء کی تحلیل واجب ہے ان کا انتہائی صغر کیمیا اور طبیعیات کے عام فنون کا استعمال محال بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ جنسی خلیہ کی کیمیائی ترکیب کروموسوم (CHROMOSOME) اور ان کروموسوم کو جمع کرنے والے توارثی عنصر (GENE) سے پردہ اٹھایا جاسکے کچھ بھی ہو، ننھے ننھے کیمیائی مواد کا کلی مجموعہ

بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہی مجموعہ فرد اور جنس کے مستقبل کا امین ہے۔ جیسے بعض معین نسوں ۔ مادۂ عصبی ۔ کی فوری طور پر تباہ ہو جانے کی اس حد تک قابلیت کہ زندگی کے دوران ان کا مطالعہ ہی محال ہے۔

ہمارے پاس ایسا کوئی فن نہیں ہے جس کی مدد سے ہم روح کی گہرائیوں اور اس کی باریکیوں تک پہنچ سکیں یا اس کے خلیوں کے درمیان تناسق اور اتحاد کا پتہ لگا سکیں۔۔۔ ہماری عقل جو بسیط حسابی تراکیب کے جمال کو پسند کرتی ہے۔ اس وقت حیران رہ جاتی ہے۔ جب ان بے اندازہ خلیوں، اخلاط اور احساسات کے بارے میں سوچتی ہے جن سے فرد بنتا ہے۔۔۔۔ اسی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ اس آمیزہ پر وہ تمام افکار منطبق کر دیں جن کی طبیعت کیمیا اور میکانیکیات میں افادیت ثابت ہو چکی ہے۔۔۔ اسی طرح فلسفی اور مذہبی نظام میں۔۔۔۔ مگر اس قسم کی کوشش سے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہمارے جسم طبعی اور کیمیائی نظام اور روحانی وجود میں نہیں بٹ سکتے۔ "علم انسان" جہاں دوسرے علوم کی آراء سے فائدہ اٹھا سکتا ہے وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مخصوص آراء کو بھی نمادے۔ کیونکہ علم انسان بھی علوم جزئیات، ایٹم اور الکٹرونکس کی طرح ایک جوہری علم ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر انسان کے بارے میں معرفت کی سست رفتاری کا علوم طبیعیت فلکیات، کیمیا اور میکانیک کی حیرت انگیز ترقی سے موازنہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ہمارے آباؤ اجداد کو فرصت کے لمحات میسر نہیں آئے۔

۲۔ موضوع انتہائی پیچیدہ ہے۔

۳۔ ہماری عقل کی ساخت

یہ تمام رکاوٹیں بنیادی ہیں اور ان کا دور کرنا آسان نہیں ہے۔ اور ان رکاوٹوں پر غلبہ پانے کے لئے سخت جد و جہد کی ضرورت ہے۔

تعبیری سادگی، تجرد اور جمال کے جس درجہ پر مادی علم پہنچ چکا ہے اس تک ہماری اپنے نفوس کے بارے میں معرفت نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ جن عناصر نے علم الانسان کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ان کا دور ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ علم الانسان دشوار ترین علم ہے۔"

اس عظیم سائنس دان ـــــ جو بڑی طویل بحثوں کے نتائج سے واقف ہے ـــ کے اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ علوم مادہ اور علوم حیات میں بنیادی فرق ہے۔ اسی طرح خود علوم مادہ اور علم الانسان کی طبیعت ہی میں بنیادی فرق ہے اور ان دونوں کے بارے میں عقل کا موقف بھی موقف ہے اور اس فرق کا تعلق وغیر متغیر اور ماحول و زمانہ و حالات سے غیر متعلق دو امور سے ہے۔

۱۔ موضوع کی پیچیدگی

۲۔ ہماری عقل کی ساخت

مادی علوم میں انسان کی ترقی، مادی دنیا میں انسان کی ایجادات اور مادی بحث و نظریات کی صحت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان علم الانسان میں بھی ترقی کرے اور اس میدان میں بھی اس کے بحث و نظریات ایسے ہی درست ثابت ہوں۔ کیونکہ ان دونوں میدانوں کی طبیعت اور مزاج مختلف ہیں۔ دونوں میں بالفعل ترقی کے درجات مختلف ہیں اور انسان دونوں ہی میدانوں میں مزید ترقی کا خواہشمند ہے۔ اور یہ کہ انسان کے بارے میں ہم بڑی گمبھیر جہالت میں مبتلا ہیں۔

## حقیقت انسان کے بارے میں اسلامی تصور

مادی علم کے ساتھ ساتھ انسان کے بارے میں اس قدر جہالت ایک علمی حقیقت ہے اور زمین میں انسان کے کردار اور کائنات میں اس کے وجود کے مقصد کا ایک متوقع نتیجہ اور امر طبعی ہے جیسا کہ اسلامی تصور سے اندازہ ہوتا ہے۔

اسلام اسی حقیقت پر نتائج مرتب کرتا ہے اور زمین میں بناؤ سنوار اور زمین کی قوتوں اور خام اشیاء کے استعمال کی قدرت اور ان اشیاء میں ترکیب، تبدیل اور تحلیل کی صلاحیت عطا

کرتا ہے۔

مگر اسلام زندگی پر حکمراں نظامِ زندگی از خود متعین کرتا ہے اور ضابطۂ حیات کی تشکیل انسان پر نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ انسان کو ایسی صلاحیتیں تو عطا کی گئی ہیں جن سے وہ اپنے علم کی بنیاد پر مادہ پر حکمرانی کر سکے۔ مگر اسے اپنے نفس کی معرفت عطا نہیں کی گئی کہ وہ اس کے بارے میں بھی اسی طرح فیصلہ کرے جس طرح وہ مادے کے بارے میں کرتا ہے۔

اسلامی تصور میں انسان اس زمین پر سردار اور اللہ کا خلیفہ ہے۔ ہر شے اللہ کی قدرت سے اس کے تابع بنادی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام ارضی وسائل کا علم عطا فرمایا ہے اور بطور نعمت زمین کی طیبات سے فائدہ اٹھانے اور جمال سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دی ہے۔

صرف زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی انسان کے فرائض خلافت میں اس کے مددگار ہیں۔ اور ان کی تخلیق میں انسان کی خلافت کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ یہ ایک بڑی عظیم الشان بات ہے۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى | وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو۔ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کریگا آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا میں |

الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا
عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ
قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا
تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی
وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ
مِنَ الْكٰفِرِیْنَ......

..........
..........
..........
..........

جانتا ہوں۔ جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے
بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے
پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ اور
فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ
کے تقرر سے نظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان
چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے عرض کیا
نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم
تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم
کو دیدیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے
اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر
اللہ نے آدم سے کہا۔ تم انھیں ان چیزوں کے نام
بتاؤ۔ جب اس نے ان کو ان سب کے نام
بتادیئے۔ تو اللہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ
تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری
حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ
تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ اور
جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے
آگے جھک جاؤ۔ تو سب جھک گئے۔ مگر ابلیس
نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا

اور نافرمانوں میں شامل ہوگیا۔

(البقرہ – ۲۹ – ۳۴)

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا۔ تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں۔ اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار رہو۔ اس نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کردیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔

(الجاثیہ – ۱۲-۱۳)

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَہَا لَکُمْ فِیْہَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْہَا تَاْکُلُوْنَ۔ وَلَکُمْ فِیْہَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ۔

اس نے جانور پیدا کئے جس میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے۔ اور خوراک بھی ہے۔ اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ ان میں تمہارے لئے جمال ہے۔ جب کہ صبح تم انھیں چرنے کے لئے بھیجتے ہو۔ اور جبکہ شام انھیں واپس لاتے ہو۔

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْہِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْہَا وَزِیْنَۃً وَّیَخْلُقُ

وہ تمہارے لئے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے! اس نے گھوڑے خچر اور گدھے پیدا کئے۔ تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ

مَالَاتَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَى اللّٰهِ
قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا
جَائِرٌ وَلَوْشَاءَ لَهَدٰكُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۔ هُوَالَّذِيْٓ اَنْزَلَ
مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ
شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ
تُسِيْمُوْنَ ۔ يُنْۢبِتُ لَكُمْ
بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَ
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۔ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ
بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ وَمَا
ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا
اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ
وَهُوَالَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا
مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا

اور بہت سی چیزیں تمہارے فائدہ کے لئے
پیدا کرتا ہے جس کا تمہیں علم تک نہیں ہے
اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا
جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ
چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ وہی
ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا
جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے
جانوروں کے لئے بھی چارہ بھی پیدا ہوتا ہے
وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اگاتا ہے اور
زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے
پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے
ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اس نے
تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو سورج
اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور سب تارے بھی
اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت سی
نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو عقل سے
کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ
کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا
کر رکھی ہیں۔ ان میں بھی ضرور نشانی ہے ان
لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کرتے والے ہیں
وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر

مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ
فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ
فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ
أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا
وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ
وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ
هُمْ يَهْتَدُونَ۔

(النحل ۔ ۵ ۔ ۱۶)

کر رکھا ہے۔ تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت
لے کر کھاؤ۔ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں
نکالو جو تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی
سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے چلتی ہے۔ یہ سب
کچھ اس لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش
کرو۔ اور اس کے شکر گزار ہو۔ اس نے زمین
میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔ تاکہ زمین
تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری
کئے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ
اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں
رکھ دیں۔ اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت
پاتے ہیں۔

مگر اسلامی تصور میں یہ انسان اس عظیم کائنات میں اللہ کا خلیفہ ہونے کے باوجود، تمام قوتیں اس کے تابع ہونے کے باوجود، اور نوامیس کائنات کے ان پہلوؤں کے ادراک کے باوجود جو خلافت کے لئے ضروری ہیں۔ ان سب امور کے باوجود انسان ایک ضعیف مخلوق ہے جس پر شہوتوں اور خواہشوں کا بھی غلبہ ہوتا ہے اور جو ضعف اور جہالت سے بھی دوچار ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس اور اس کے ضابطہ حیات کو اس کی شہوتوں، خواہشوں، ضعف اور جہالت پر نہیں چھوڑا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت اور رعایت سے اس پہلو پر خود ہی توجہ فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ انسان اپنے وجود پر اس قدر قدرت نہیں رکھتا جس قدر اسے مادے پر حاصل ہے اور نہ انسان اپنے وجود کے مقتضیات سے اس قدر واقف ہے۔ جتنا کہ وہ مادی قوانین سے واقف ہے۔

## ضعف انسانی کی پہلی مثال

سب سے پہلی مثال جو انسان کے ضعف، عجز اور شہوتوں کے سامنے جھکنے کی ہمارے سامنے آتی ہے وہ قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ انسان ہمیشہ زندہ رہنے، اور ملک حاصل کرنے کی خواہش میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا۔ اور یہ فراموش کر بیٹھا کہ شیطان اس کا دشمن ہے اور اس کی گھات لگائے بیٹھا ہے اور انسان یہ بھی بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی شیطان سے ڈرا چکا ہے۔

یہ واقعہ انسان میں پوشیدہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان اللہ سے پناہ نہ حاصل کرے۔ اور اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر نہ چلے تو وہ دنیاوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں شقاوت اور بدبختی میں مبتلا رہے گا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ

اور اس سے پہلے ہم آدمؑ کو ایک حکم دے چکے تھے سو ان سے غفلت اور بے احتیاطی ہوگئی۔ اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔ اور وہ وقت یاد کرلو، جب کہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو۔ سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا۔ پھر ہم نے آدمؑ سے کہا کہ اے آدم یاد رکھو یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بی بی کا دشمن ہے۔ سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوادے۔ پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ آرام ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے رہوگے۔ اور نہ ننگے رہوگے اور نہ یہاں پیاسے رہوگے اور نہ دھوپ میں تپوگے۔ پھر ان کو شیطان نے بہکایا۔ کہنے لگا۔

لَا يَبْلٰى فَاَكَلَا مِنْهَا
فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا
وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰى
اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ثُمَّ
اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ
عَلَيْهِ وَهَدٰى قَالَ
اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ
مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ
اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا
يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ
اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ
فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً
ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى
قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْ
تَنِيْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ
بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ
اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا

اے آدم کیا میں تمہیں ہمیشگی کی خاصیت کا درخت
بتلاؤں۔ اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی
ضعف نہ آوے۔ سو اس کے بہکانے سے دونوں
نے اس درخت سے کھالیا۔ تو ان دونوں کے ستر
ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔ اور اپنا بدن
ڈھانپنے کو دونوں اپنے اوپر درختوں
کے پتے چپکانے لگے۔ اور آدمؑ سے اپنے رب کا قصور
ہوگیا۔ سو غلطی میں پڑ گئے۔ پھر ان کو ان کے رب
نے زیادہ مقبول بنالیا۔ سو اس پر توجہ فرمائی اور
راہِ راست پر ہمیشہ قائم رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
کہ دونوں جنت سے اترو۔ اور دنیا
میں ایسی حالت سے جاؤ کہ ایک کا دشمن ایک
ہوگا۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی
ہدایت پہنچے۔ تو جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع
کرے گا۔ تو وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا۔ اور نہ آخرت
میں شقی ہوگا۔ اور جو شخص میری اس نصیحت سے
اعراض کرے گا۔ تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا
اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا کر کے قبر سے
اٹھائیں گے۔ وہ (تعجب سے) کہیگا۔ اے میرے رب
آپ نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ میں تو
دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ ایسا

فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى۔

(طٰہٰ۔ ۱۱۵۔ ۱۲۷)

ہی تیرے پاس ہمارے احکام پہنچے تھے۔ پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاوے گا۔ اور اسی طرح ہر اس شخص کو ہم مناسب عمل کی سزا دیں گے جو حد اطاعت سے گزر جاوے۔ اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لاوے۔ اور واقعی آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بڑا دیرپا ہے۔

## انسان اپنے لئے ضابطہ حیات خود نہیں بنا سکتا

قرآن کی کثیر آیات اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان اپنے نفس، اپنے مستقبل اور اپنے افعال کے انجام سے سراسر ناواقف ہے۔ یہی نہیں، بلکہ انسان شہوتوں خواہشوں اور ضعف سے اس قدر مغلوب ہے کہ اس میں کسی طرح یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اپنا ضابطہ حیات خود متعین کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ منہاج کے دائرے میں رہتے ہوئے انسان کو مادے کے استعمال پر قدرت حاصل ہے اور وہ مادی قوانین سے اس حد تک واقف ہے جس حد تک خلافت کے لئے ضروری ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم۔ ۶۔ ۷)

یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (الاسراء۔ ۸۵)

یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۖ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ

(لقمان۔ ٣٤)

کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے۔ اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین پر اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔

آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (النساء۔ ١١)

تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

(النساء۔ ١٢)

ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو۔ مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھدی ہے۔

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(البقرہ۔ ٢١٦)

ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو۔ اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے۔ تم نہیں جانتے۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

(الطلاق۔ ١)

شاید اللہ تعالیٰ بعد (اس طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل میں) پیدا کردے۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔

(النجم۔ ٢٣)

یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔

(النجم۔۲۳) (المومنون۔۷۱)

اگر دین حق ان کے خیالات کے مطابق ہو جاتا تو تمام آسمان اور زمین اور جو ان میں آباد ہیں۔ سب تباہ ہو جاتے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا۔

(المعارج۔۱۹)

انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع و فزع کرنے لگتا ہے اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے

اس قسم کے اشارات قرآن کریم میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اور اکثر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور ہدایت کے بیان کے بعد آئے ہیں۔ جو انسانوں کو یہ بتلاتے ہیں۔ کہ وہ اپنے لئے قوانین نہیں بنا سکتے۔ اور ان کے پاس ایسی قدرتیں اور صلاحیتیں موجود نہیں ہیں۔ کہ وہ اپنے لئے ضابطہ حیات متعین کر سکیں۔ کیونکہ وہ اپنے آپ سے اور اپنے تصرفات اور اپنی خواہشوں کے انجام سے ناواقف ہیں۔ اور اپنی خواہشات اور شہوتوں کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اور یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اپنا قانونِ زندگی خود بنائیں۔ اور اپنی زندگی کا منہاج آپ متعین کریں تو ان کا وجود اور ان کا سفر حیات خطرے میں پڑ جائے۔

چنانچہ اس قسم کے ارشادات ہمیں مندرجہ ذیل مواقع پر ملتے ہیں:۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(الجاثیہ۔۱۸)

اس کے بعد اے نبی! ہم نے آپ کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ جو علم نہیں رکھتے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ

تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں

كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ-٥٦)

ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النسا-١٩)

اے ایمان لانے والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ

اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے۔ کہ جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دینے لگو۔ تو ان کو زمانۂ عدت (حیض) سے پہلے طلاق دو اور تم عدت کو یاد رکھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو تمہارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے نہ نکالو۔ اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں۔ مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں

مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ
وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا
تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ
بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

(الطلاق - ۱)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ
اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ
حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ
كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ
اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا
مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً
فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ
لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ
لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ
فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ
كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ
السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ

تو اور بات ہے۔ اور یہ سب خدا کے مقرر
کئے ہوئے احکام ہیں۔ اور جو شخص احکام
خداوندی سے تجاوز کرے گا۔ اس نے اپنے
اوپر ظلم کیا۔ تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ (بعد
طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل
میں) پیدا کر دے۔

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں
ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصّہ دو عورتوں کے
برابر ہے۔ اگر میت کی وارث دو سے زائد لڑکیاں
ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور
اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس
کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے
والدین میں سے ہر ایک کو ترکہ کا چھٹا حصّہ
ملنا چاہیئے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو
اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو
تیسرا حصّہ دیا جائے۔

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو
ماں چھٹے حصّے کی حقدار ہو گی۔ (یہ سب حصّے
اس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیت
جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے۔ اور
قرض اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ تم نہیں

آبَاؤُکُمْ وَاَبْنَاؤُکُمْ لَاتَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا۔ (النسا۔ ۱۱)

جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

## خدا کے دیئے ہوئے ضابطے جو تسلیم کرنا شرطِ ایمان ہے

ہمیں قرآنِ کریم میں ایسی فیصلہ کن نصوص بڑی تاکید اور بڑے زور دار انداز بیان کے ساتھ ملتی ہیں جن میں کسی قسم کے حیلے بہانے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات کو اپنا ضابطہ نہ بنائے۔ اور جب تک وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کو اپنی عملی زندگی میں نافذ نہ کرے۔ اپنی طرف سے زندگی کا کوئی ضابطہ اور قانون وضع نہ کرے۔

نہ اپنے لئے حقِ قانون سازی کا دعویٰ کر کے اپنے آپ کو الوہیت کا دعویدار بنائے اور اس طرح اللہ کی الوہیت کا منکر ہو جائے۔ بلکہ ہر اس شخص سے روگرداں ہو جائے جو اللہ کے علاوہ خود قانون سازی کا حق حاصل کرے اور اللہ کے بنائے ہوئے ضابطہ زندگی کو چھوڑ کر کوئی اور ضابطہ زندگی بنائے۔ اور اس طرح اپنی الوہیت کا دعویدار بن کر اللہ کی الوہیت کا منکر ہو جاتے۔

اسلام کے اس بنیادی اصول کو بیان کرنے کے لئے بڑی تاکید کے ساتھ نصوص آئی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ

اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔

يُرِيدُونَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا فَكَيْفَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا فَلَا

مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے۔ اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو۔ کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آن پڑتی ہے۔ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تم صرف بھلائی چاہتے تھے۔ اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان سے تعرض مت کرو انھیں سمجھاؤ۔ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے (انہیں بتاؤ) کہ ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بناء پر اس کی اطاعت کی جائے اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا۔ کہ جب یہ

وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ
وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(النساء- ۶۰-۶۵)

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا
هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا
النَّبِيُّونَ الَّذِينَ
أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا
وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ
بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ
كِتَابِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ
شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ
وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا
بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَنْ
لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا

اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے۔ تو تمہارے پاس
آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی
ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا۔ تو یقیناً
اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے ہیں
اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن
نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات
میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو
کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی
تنگی نہ محسوس کریں۔ بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔
ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی
تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق
ان یہودی بنجانے والوں کے معاملات کا فیصلہ
کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی
(اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں
کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا
اور وہ اس پر گواہ تھے پس (اے گروہ یہود)
تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری
آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے کر بیچنا چھوڑ دو
جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق
فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ تورات میں ہم
نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا۔ کہ جان کے

أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ
بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ
وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ
بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ
فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ
كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ
بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. وَقَفَّيْنَا
عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ
الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى
وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ
وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ
وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ
بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ
لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ
وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ

بدلے جان آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے
بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے
بدلے دانت اور تمام زخموں کے بدلے برابر
کا بدلہ پھر جو قصاص کا صدقہ کردے تو وہ
اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے
نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں
وہی ظالم ہیں۔ پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد
مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا تورات میں سے
جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ اس کی
تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل
عطا کی جس میں راہ نمائی اور روشنی تھی۔ اور
وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود
تھا۔ اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا
ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت
تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون
کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں
نازل کیا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ
قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق
ہیں۔ پھر اے محمد! ہم نے تمہاری طرف یہ
کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے۔ اور الکتاب
میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے۔ اس

مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ
بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ
لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا وَّلَوْ شَاءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً
لِيَبْلُوَكُمْ فِيْمَا آتَاكُمْ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۔ إِلَى
اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ۔ وَأَنِ احْكُمْ
بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
وَاحْذَرْهُمْ أَنْ
يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ
مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ
أَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ
يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ
أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ

کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان
ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق
لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے
پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات
کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم سے ہر ایک کے لئے
ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔ اگرچہ
تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امّت بھی
بنا سکتا تھا۔ لیکن یہ اس نے اس لئے کیا کہ جو
کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری
آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے
سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار
تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ
تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم
اختلاف کرتے رہے ہو۔ پس اے محمدؐ! تم اللہ
کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے
معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات
کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو
فتنے میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر
انحراف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف
نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو
جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی

يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔

(المائدہ ۔ ۴۴ ۔ ۵۰)

پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں ۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو پھر کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں ۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔

مندرجہ بالا آیات سے انسان کے بارے میں اسلام کا نظریہ بخوبی واضح ہو گیا ہے کہ انسان کو مادے پر بالادستی حاصل ہے ۔ مادہ اس کے لئے مسخر ہے اور جس قدر خلافت کے لئے ضروری ہے ۔ اس قدر انسان کو نوامیس کائنات کی معرفت بھی حاصل ہے ۔ مگر ساتھ ہی انسان اپنی ذات کی معرفت سے عاجز ہے ۔ یہ معرفت اسے اس درجہ وضاحت سے حاصل نہیں ہے جس طرح وہ مادی قوانین کو جانتا ہے ۔ اسی لئے انسان اپنا ضابطہ حیات خود بنانے سے عاجز ہے ۔ بلکہ اس میں اللہ کی مدد کی ضرورت ہے کہ وہ انسان کے لئے ایسا ضابطۂ حیات بنائے جو اس کے مزاج اور فطرت کے مطابق اور دنیا میں اس کے کردار کے مناسب ہو ۔

## ضابطۂ الٰہی ترک کرنے کے نتائج

اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر رہے ۔ اور اگر وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں چلے گا ۔ یا اللہ کے قانون کے بعض پہلوؤں کو اپنا کر ان میں اپنی طرف سے اضافہ کرے گا تو وہ دائرۂ ایمان اور اسلام سے خارج سمجھا جائے گا ۔

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

(المائدہ)

ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے ۔

اور اگر انسان اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے گریز کرے گا تو اس کی دونوں زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ۱۲۴)

اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا کرکے قبر سے اٹھائیں گے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرہ ۲۷۹)

لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

انسان کو اپنے بارے میں معرفت کی کس قدر صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ اور زندگی میں اس کے مقتضا کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کرنے کے بعد ہم اس المیہ کے عناصر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس المیہ سے آج انسانیت دوچار ہے اور جو اس نے انسان کے بارے میں اپنی لامتناہی جہالت کے باوجود اپنی تہذیب اور اپنا ضابطہ حیات خود وضع کرکے اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔

اس عظیم سائنسدان کے بقول اس المیہ کا ایک بنیادی عنصر یہ بھی ہے۔ کہ انسان مادے کے بارے میں وسیع علم کے باوجود خود اپنے بارے میں گمبھیر جہالت میں مبتلا ہے ـ اور یہ وجہ بھی اس المیہ کا بذات خود سبب نہیں ہے بلکہ حقیقی سبب یہ ہے کہ اس وجہ کو مدنظر نہیں رکھا گیا بلکہ اس حقیقت کے باوجود انسانی زندگی کا ضابطہ خود وضع کرنے پر اصرار کیا گیا۔ اور یہ ضابطے اللہ کی ہدایت سے گریز کرکے وضع کئے گئے۔ بلکہ ان میں اللہ کی ہدایت سے نفرت اور دشمنی کو بنیاد بنایا گیا۔

جیسا کہ قرآن کریم ان لوگوں کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (المدثر ۴۹-۵۱)

ان لوگوں کو کیا ہوا کہ اس نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں۔ کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں، جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں۔

یہاں سے ہم اس المیہ کے دوسرے عنصر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

---

# گمراہی اور اضطراب

انسان کے بارے میں جس گمبھیر جہالت کا تذکرہ ڈاکٹر الکسیس کاریل نے بیسویں صدی کی نصف میں کیا ہے. ظاہر ہے یہ جہالت اس صدی سے پہلے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو گی کیونکہ اس وقت تک انسان کے بارے میں معرفت حاصل کرنے کے لئے اس قدر جد وجہد نہیں کی گئی تھی. بلکہ اس وقت تک انسان اور علوم انسان موضوع بحث ہی نہیں بنے تھے۔

انسان کے بارے میں اس جہالت کے متعدد پہلو بہر حال باقی رہیں گے. خواہ اس کے لئے کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جائیں اور بحث وتحقیق کے نئے نئے پہلو کیوں نہ سامنے آجائیں. کیونکہ ایک طرف تو موضوع حیات کی پیچیدگی میں کتنی ہی دشواریاں اور صعوبتیں پنہاں ہیں اور دوسری طرف ہماری اپنی عقل کی طبیعت میں اس قسم کی صعوبات موجود ہیں۔

انسان کی اپنے بارے میں اس جہالت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ سے متصل اور اس سے قریب ہے. اس سے مدد مانگتا رہے. اور اس کے نازل کردہ علم وحکمت پر مبنی طریقہ سے ہدایت پائے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ مادی دنیا میں اپنی عقل وعلم اور مادی صنعتوں میں اپنی مہارت سے فریب نہ کھائے. خواہ اس کی صلاحیتیں کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائیں۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگے. کہ اس نے اس میدان میں معجزے دکھائے ہیں — یہ فریب انسان کو مجبور کر دے گا کہ انسان مادی دنیا میں اپنے تجربات کو عالم حیات اور خاص طور پر انسانی زندگی پر منطبق کرے۔ اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر۔ بلکہ اللہ کے طریقے سے دشمنی اور

روگردانی کی بنیاد پر اپنے لئے خود ضابطہ حیات متعین کرے۔

مگر جو کچھ یورپ میں ہوا ہے اور جو دنیا یورپ سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی وہ اس کے برعکس ہے۔ اور اسی کے نتیجہ میں گمراہی اور بدبختی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اب انسانیت، ہلاکت و تباہی کے غار میں لڑھک رہی ہے۔ اور انسانی وجود اس سخت ترین مصیبت سے دوچار ہے۔

بیسویں صدی کے نصف میں جس علمی دیانت سے ڈاکٹر کاریل نے یہ بات کہدی کہ — "فی الحقیقت ہم بڑی گمبھیر جہالت میں مبتلا ہیں" اس بات کو یورپ کے مذہب بیزاری کے طوفان میں کہنا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ کلیسا اور سائنس دانوں کے درمیان جو تلخ ترین واقعات پیش آتے ہیں۔ ان کی بنا پر اہل یورپ کلیسا اور مذہب کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔ اس فرار میں عقل و شعور کا کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ وہ اس سلسلہ میں عقل سے مشورہ لیتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کلیسا اور مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور انسان مادی دنیا میں ترقی کرنے کے باوجود انسانی زندگی کا کوئی ضابطہ وضع کرنے سے عاجز ہے۔

یورپ کے اس فرار کے کئی اسباب ہیں . . . ہم اس کے متعدد عناصر میں سے ایک عنصر بیان کرتے ہیں۔

## یورپ کی علمی ترقی پر اسلامی تہذیب کے اثرات

علمی بحث کے اسالیب اندلس اور مشرق کی جامعات میں اسلام کے زیر سایہ ابھرے ہیں۔ جیسا کہ ڈوہرنگ[1] اور بریوالٹ کہتے ہیں — پندرھویں صدی میں

---

[1] یوجین کارل ڈوہرنگ (EUGENE KARL DUHRING 1831-1921) مشہور جرمن فلسفی اور ماہر معاشیات ہے۔ اس کے خیال میں سرمایہ داری نظام کی خرابیاں مزدوروں کی ایک منظم تحریک سے دور کی جاسکتی ہیں۔ ڈوہرنگ کی شہرت مارکس اور اینگلز کی تنقیدات کی مرہون منت ہے۔ (س۔ا۔ صدیقی)

یورپ ان جامعات سے سیراب ہوا۔ اور اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ان اسالیب اور تجربی مذہب سے روشناس ہوا۔ جس تجربی اسکول کے ذریعہ روجر بیکن[1] اور فرانسس بیکن[2] متعارف ہوئے)۔ اور روجر بیکن تو صاف صاف اعتراف کرتا ہے کہ اس نے تجربی طریقہ مسلمانوں سے سیکھا ہے۔

ڈھرنگ کہتا ہے:

مختلف علوم میں راجر بیکن کی آراء فرانسس بیکن سے زیادہ واضح اور زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں۔

روجر بیکن نے اندلس کی اسلامی درس گاہوں سے علم حاصل کیا ہے۔ اس کی کتاب (OPUS MAJUS) کا پانچواں باب جو لیبریات پر مشتمل ہے۔ وہ دراصل ابن ہیثم کی کتاب المناظر کی نقل ہے۔ بیکن کی کتاب اس امر بھی پوری طرح گواہ ہے کہ وہ ابن حزم سے کس قدر متاثر ہے۔

بریفالٹ اپنی کتاب "تعمیر انسانیت" (Making of Huminity) میں لکھتا ہے:۔

روجر بیکن نے عربی زبان اور عربی علوم آکسفورڈ میں اندلس کے عرب اساتذہ سے پڑھے ہیں کسی کو یہ حق نہیں کہ تجربی اسکول کی ایجاد کو راجر بیکن یا اس کے ہم نام کی جانب منسوب کرے حقیقت یہ ہے کہ روجر بیکن نے صرف مسلمانوں کے علم اور ان کے طریقے کو مسیحی یورپ تک پہنچایا ہے۔ اس نے

---

[1] راجر بیکن (ROGER BACON 1214-1294) انگریز مفکر و سائنس دان جس نے بارود مشینی کشتیوں اور ہوائی جہاز کے امکانات کی خبر دی۔ ۱۲۶۶ء میں پوپ کلیمنٹ کی دعوت پر (OPUS MAJUS) لکھنی شروع کی۔ جو جملہ علوم و فنون کے مبادیات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۷۷ء میں کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دیکر جیل میں ڈال دیا۔ وہیں انتقال ہوا۔ (س۔ صدیقی)

[2] فرانسس بیکن (FRANCIS BACON 1561/1626) انگریز ادیب، سیاستدان، ملکہ الزبتھ کا اٹارنی جنرل اور جیمز اول کا لارڈ چانسلر۔ جدید سائنس میں استقرائی طریق کے اصول منضبط کئے۔ انجیل کا مروجہ ترجمہ اسی کا ہے (س۔ صدیقی)

کبھی اس اقرار سے گریز نہیں کیا ہے کہ اس نے عربی زبان اور عربی علوم اپنے معاصرین سے سیکھے ہیں جو اس وقت علم و معرفت کا واحد طریقہ تھا۔ تجربی اسکول کے موجدین کے بارے میں بحث دراصل مغربی تہذیب کے اصولوں میں زبردست تحریف ہے۔ حالانکہ عربوں کا تجربی طریقہ بیکن کے زمانے میں خوب اچھی طرح اشاعت پا چکا تھا۔ اور یورپ کے لوگ اس کے حصول کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ (ص ۲۰۲)۔

عربی تہذیب نے موجودہ دنیا کو جو میراث سپرد کی ہے۔ ان میں اہم ترین علم ہے۔ اگرچہ اس کے ثمرات کافی تاخیر سے ظاہر ہوتے .... ہسپانوی عربوں کی ثقافت نے جس عبقریت کو جنم دیا تھا وہ اپنے عنفوانِ شباب کو اس وقت پہنچی جب اس تہذیب کو پس پردہ کئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ صرف علم ہی یورپ کو حیات نو بخشنے والا نہیں ہے بلکہ اسلامی تہذیب کے بہت سے موثرات ہیں جنہوں نے اپنی ابتدائی کرنیں یورپ پر ڈالی ہیں۔ (ص ۲۰۲)

یوروپی تمدن کی چمک دمک کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی اصل یقینی طور پر اسلامی تہذیب کے اثرات نہ ہوں۔ نئی دنیا کی ممتاز ترین قوت اور موجودہ تمدن کی اصل یعنی طبعی علوم اور علمی بحث کی روح میں بھی یہ اثرات نہایت نمایاں اور واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ (ص ۱۹۰)۔

ہمارا علم عربوں کا صرف اس قدر ہی مقروض نہیں ہے۔ کہ انہوں نے ہمیں جدید ترین نظریات اور حیرت انگیز اکتشافات عطا کئے ہیں۔ بلکہ ہمارا علم سارا کا سارا عربوں کا بخشا ہوا ہے۔ کیونکہ قدیم دنیا میں سرے سے علم کا وجود ہی نہیں تھا۔

یونانیوں کے نجوم اور ریاضی بھی اجنبی علوم تھے۔ جو انھوں نے خود دوسروں سے لئے تھے اور ان علوم نے نہ تو کبھی یونانی فضا کو اپنایا اور نہ ہی یونانی ثقافت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئے یونانیوں نے مذاہب بھی تخلیق کئے۔ احکامات میں بھی ہمہ گیری پیدا کی اور نظریات بھی وضع کئے۔ مگر بحث کے ٹھوس اور سنجیدہ انداز، ایجابی معلومات کا جمع وارتکاز، علم کے تفصیلی مناہج، کسی مسئلہ

پر مسلسل دقیق مطالعہ اور تجربی بحث ۔ یہ سب باتیں یونانی مزاج سے بہت دور تھیں۔ قدیم دنیا میں علمی بحث نے صرف اسکندریہ کے ہیلینسی دور میں تھوڑا بہت نشوونما حاصل کیا تھا مگر آج ہم جس چیز کو سائنس کہتے ہیں تو وہ بحث کی نئی روح اور تلاش وجستجو کے جدید طریقوں کے نتیجہ میں یوروپ میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اور تجربہ، مقیاس اور ایسی ترقی یافتہ ریاضیات۔ جس سے اہل یونان واقف بھی نہ تھے۔ اس کے وجود میں معاون بنے ہیں۔ اور یہ روح علمی اور یہ مناہج بحث یورپ کو عربوں نے بخشے ہیں۔ (ص ۱۰۹)

## کلیسا سے بیزاری

جب یوروپ کی عقلیت تک مسلمانوں کا واقعی اور تجربی طریقہ کار پہنچا۔ تو مغربی فکر بھی علمی اور تجربی بحثوں میں مصروف ہو گئی۔ اس علمی تحقیق کے نتیجہ میں نئے نئے فلکی، جغرافیائی اور طبیعی حقائق سامنے آئے۔ جو اس مجموعہ اوہام دیومالا، اور خرافات کے برعکس تھے۔ جن کو کلیسا نے اپنایا ہوا تھا۔ اور جنھیں وہ مقدس حقائق بتاتا تھا۔ حالانکہ اس خرافات کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اس زمانے کے لوگوں میں پھیلے ہوئے غیر علمی افکار تھے۔ اللہ کے نازل کردہ نہیں تھے۔ انہی افکار کو کلیسا نے اپنا لیا۔ اور اس طرح ان کی مدافعت کرنے لگا جیسے یہ بھی عقیدہ کا ایک جزء ہوں۔

کلیسا نے اندلس اور مشرق کی اسلامی ثقافت سے پھوٹنے والی اس نئی رو کے بالمقابل نہایت سخت موقف اختیار کیا۔ اور یوروپ کے جو سائنس دان اس چشمے سے سیراب ہوئے ان کی تحقیقات کا کلیسا نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا اور انتہائی وحشیانہ طریقے پر اپنے اقتدار کو ان کے خلاف استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں کلیسا، اور کلیسا کے اس خدا سے بیزاری پیدا ہو گئی۔ جس خدا کے نام پر کلیسا خوب خوب جھوٹ بولتا اور بہتان تراشی کرتا تھا۔ لوگ مذہب کے سائے سے بھی بیزار ہو گئے۔ مذہب کے اعتراف اور اس کے سامنے جھکنے کے معنی کلیسا کے ظالمانہ اور جابرانہ اقتدار کو تسلیم کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کے ہو گئے۔

اسی وجہ سے بیسویں صدی کے شروع تک مذہب و سائنس میں سخت ترین تفریق قائم

ہوگئی۔ لوگوں کی ۔ اور سائنسدانوں کی بالخصوص ۔ مذہب بیزاری کی یہ کیفیت ہوگئی جیسے شیر کو دیکھ کر گدھے بھاگ کھڑے ہوں۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب لوگ چار صدیوں کے طویل اور پر مشقت بیابانی سفر کے بعد سانس لینے رُکے تو اُنھیں شدت سے روحانی خلا محسوس ہوا تو کسی قدر مذہب بیزاری میں کچھ کمی واقع ہوئی۔

## گمراہی کے نتائج واثرات

ہم اس مختصر گفتگو میں وہ تمام حالات بیان نہیں کر سکتے جو مذہب وسائنس کی تفریق[1] کا باعث بنے۔ نہ ہم تفصیل سے یہ بیان کر سکتے ہیں کہ مذہب بیزاری کا یہ تھکا دینے والا سفر کس قدر طویل ہوا۔ اور اللہ سے بیزار ہوکر اور اللہ کے متعین کردہ ضابطۂ اخلاق کو چھوڑ کر اور ان طویل صدیوں میں اپنے لئے خود ضابطہ ہائے حیات بنا کر انسانیت کو کس بدبختی اور شقاوت سے دوچار ہونا پڑا۔

مگر ہم اس طویل گمراہی کے چند نمونے ضرور پیش کریں گے۔

❖ ❖ ❖

حقیقت انسان کے بارے میں ہماری جہالت اور اس حقیقت کے تمام پہلوؤں کے عدم ادراک کا بالکل طبعی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کا کوئی مضبوط مکمل اور صالح نظام بنانے سے قاصر ہیں۔ اور اگر ہم اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر کوئی نظام بنا بھی لیں تو وہ یقیناً انسانی زندگی کو اور خود انسان کو ہلاکت اور تباہی میں مبتلا کر دے گا۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے ۔ مگر ہم اس کو محسوس واقعی اور عملی صورت میں پیش کرتے ہیں فرض کر لیجئے اگر ہم قوانین مادہ سے بھی اسی طرح ناواقف ہوتے۔ جس طرح ہم قوانین زندگی۔ اور خاص طور پر انسانی زندگی سے ناواقف ہیں۔ پھر ہم مادہ کو کلی یا جزئی طور پر کام میں لاتے۔ تو نتیجہ یہی ہوتا کہ مادہ ضائع ہوجاتا ۔ بالکل یہی صورت انسانی زندگی میں پیش آتی ہے۔

مگر عام مادہ کا ضیاع اور تباہی ایسی نہیں ہے کہ اس کے اثرات دور نہ کیے جا سکیں۔ اور اس

---

[1] اس موضوع کو پوری تفصیل سے "اسلام کا مستقبل" میں "بدترین تفریق" کے زیر عنوان دیکھئے۔

میں عنصر انسانی اور حیات انسانی جیسی قیمتی اور انمول اشیاء ضائع نہیں ہوتی۔ نہ اُن کے نتائج وہ کچھ ہوتے ہیں۔ جو انسانی معاملات کو اللہ سے دور رہ کر حل کرنے سے ہوتے ہیں۔ (جبکہ اللہ تعالیٰ انسان کی حقیقت سے واقف، اس کی زندگی میں حکمران نوامیس کا جاننے والا۔ اور انسان کے اور کائنات کے روابط سے باخبر ہے)۔ نہ اس میں اس قدر گمراہی، شقاوت، حیرت اور قلق، تباہی اور فساد برپا ہوتا ہے۔ اور نہ بالآخر اس بدبختی کا انجام بالکلیہ تباہی کے خطرے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

یہ بدترین مظاہر جو تمام انسانی زندگی پر چھائے ہوتے ہیں۔ اپنے دامن میں عظیم قربانیاں ہولناک قتل، سرکش انقلابات، اور ایسی بدبختی لئے ہوتے ہیں جس نے کائنات کے قیمتی عنصر انسان کو تباہ کر دیا ہے۔

ہم انسانی زندگی کے تجربات کے چند نمونے بیان کریں گے۔ جو اس نے اس قدیم تاریخ سے لے کر آج تک اللہ کی ہدایت اور اللہ کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے ہٹ کر کئے ہیں۔ یہ چند نمونے ہی تمام تاریخ کے لئے اشارہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ تمام واقعات کو دہرانا مشکل بھی ہے۔ اور ہماری مختصر بحث اس کی متحمل بھی نہیں ہے۔

یہ مثالیں انسانی زندگی کے تین اہم مسائل پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ انسان کی حقیقت اس کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کے بارے میں نقطہ نظر

۲۔ عورت اور صنفی تعلقات کا مسئلہ

۳۔ معاشی اور اجتماعی نظام۔

---

# انسان کی فطرت اور اسکی صلاحیت

انسان اس کائنات میں ایک منفرد وجود ہے۔ وہ اپنی طبیعت میں منفرد، اپنے کردار اور اپنے مقصد وجود میں یکتا، اور اپنے مآل و انجام میں جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔

ان تمام مخلوقات میں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ مخلوقات جن کو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور ان تمام مخلوقات میں انسان بے نظیر و بے مثال ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تخلیق کیا ہے۔ صرف اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آگیا۔ اور انسان با مقصد خلق ہے بیکار و عبث نہیں ہے۔

گزشتہ باب میں جو ہم نے قرآنی آیات نقل کی ہیں۔ اور جو انسان کے بارے میں اسلام کا نظریہ بیان کیا ہے اس سے یہ تمام امور بخوبی واضح ہو چکے ہیں۔

## انسان کے حیوان بننے کا جدید تصور

عالم احیاء میں انسان کے امتیازی خصوصیات پر نظر کرتے ہوئے اور حقائق واقعیہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر جدید ڈارونیت (NEO — DARWINISM) میں جولیان ہکسلے[1] کو

---

[1] جولیان ہکسلے (JULIAN HUXLEY 1887) انگریز سائنسدان جس نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک آکسفورڈ میں حیوانیات کی تعلیم دی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک نیو آکسفورڈ کالج میں شعبۂ حیاتیات کا صدر رہا دو برس کنگ کالج لندن میں حیاتیات کا پروفیسر رہا ۱۹۴۶ء میں یونیسکو کا ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوا (مرسلیقی)

ڈارون[1] کی قدیم ڈاروینیٹ سے کافی کچھ رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ اعتراف کرتا ہے کہ انسان ایک مخصوص حیوان ہے۔ اور اس میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو اور کسی حیوان میں موجود نہیں ہیں۔ اور ان خصوصیات کے اثرات بڑے منفرد قسم کے اثرات ہیں۔

ذرا دیکھئے وہ اپنی کتاب "انسان دورجدید میں ___ انسان کی انفرادیت کے زیرعنوان کیا کہتا ہے :۔

" دیگر حیوانات میں اپنے مقام کے بارے انسان کی رائے گھڑی کے پینڈولم کی طرح متحرک رہی ہے۔ کبھی اس نے اپنے آپ کو عظیم تر جانا اور کبھی کمتر خیال کیا۔ کبھی اس میں اور دیگر حیوانات میں بہت بڑا فصل پیدا ہو گیا اور کبھی سکڑ کر بالکل مختصر رہ گیا۔

نظریہ ڈارون کے بعد سے پینڈولم کی الٹی حرکت شروع ہو گئی اور انسان پھر سے حیوان سمجھ لیا گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ ڈارون کے مفروضات کو منطقی نتائج کی حیثیت دیدی گئی اور لوگ اس پر ایمان لے آئے۔ کہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح کا ایک حیوان ہے۔ اس لئے حیات انسانی کے بارے میں انسان کی آراء ٹیپ وارم (TAPE-WARM) اور بیکیٹریا باسلس (BACTERIA BACILLUS) کی آراء سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ کسی شے کا بقا ہی ارتقائی کامیابی کا پیمانہ ہے۔ کیونکہ تمام زندہ کائنات مساوی قیمت کی حامل ہے۔ اور ترقی صرف انسانی فکر ہے۔ اور یہ بات اگرچہ تسلیم شدہ ہے کہ اس وقت انسان ہی تمام مخلوقات کا سردار ہے۔ مگر اس مقام پر ارتقا کر کے بلی اور چوہے بھی پہنچ سکتے ہیں۔

یہاں انسان اور حیوان کے درمیانی فاصلے اس لئے کم نہیں ہوئے کہ حیوان کو انسانی

---

[1] چارلیس رابرٹ ڈارون (CHARLES ROBERT DARWIN 1809/1882) انگریز سائنس دان جس نے نظریہ ارتقاء اور بقائے اصلح کا اصول پیش کیا۔ ۱۸۵۹ء میں اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) شائع کرائی جس پر مذہبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کی دوسری کتاب (DESCENT OF MAN) شائع ہوئی۔ (س صدیقی)

صفات دیدی گیئں۔ بلکہ اس لئے کہ خود انسان سے انسانی صفات سلب کرلی گیئں — مگر کچھ عرصہ علم کی زیادتی اور علمی تجزیے کی وسعت کی بناء پر ایک نیا رخ بھی سامنے آیا ہے۔

## انسان منفرد اور بے مثل حیوان

پنڈولم نے پھر حرکت کی ہے۔ اور انسان و حیوان کے درمیان فاصلے پھر سے بڑھ گئے ہیں۔ اگرچہ نظریۂ ڈاروِن کے بعد انسان اپنے آپ کو حیوان ہونے سے تو نہیں بچا سکتا۔

مگر اب وہ اپنے آپ کو ایک منفرد اور بے مثل حیوان خیال کرنے لگا ہے۔ حیاتیاتی لحاظ سے انسان کی انفرادیت کا تجزیہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے اور یہ گفتگو انسان کے موجودہ مقام کو بیان کرنیکی کوشش ہے۔

انسان کی سب سے اولین عظیم اور واضح منفرد خصوصیت اس کا تصوری فکر پر قادر ہونا ہے اس بنیادی خصوصیت کے کئی نتائج رونما ہوتے ہیں۔ جن میں سب سے اہم روایات کا نشو و نما ہے زیادتی روایات اور حقیقی مظاہر میں سب سے اہم انسان کا اپنے سامان اور آلات کو بہتر بنانا ہے۔ سازوسامان اور روایات ہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے انسان کو تمام کائنات میں مرکزِ سیادت عطا کیا ہے۔ اور موجودہ وقت میں یہ حیاتیاتی سیادت بھی انسان کی ایک منفرد خصوصیت بن گئی ہے۔

اسی طرح علم حیاتیات بھی انسان کو اشرف المخلوقات کا وہ درجہ دیتا ہے۔ جو مذاہب نے اسے دیا ہے۔[1]

کلام، روایات اور سازوسامان نے انسان میں ایسی کئی خصوصیات پیدا کردی ہیں۔

---

[1] اس اعتراف کے باوجود آگے چل کر پھر ہکسلے اپنے موقف سے گریز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تفصیلات اور اکثر مستندات کے لحاظ سے مذہب کا نظریہ صحیح نہیں ہے" پھر جب حقائق مجبور کرتے ہیں تو دوبارہ کہتا ہے: مذہب کی مضبوط حیالوجی بنیاد موجود ہے" غرض ہکسلے حقائق کے دباؤ اور الحاد کے تقاضوں کی کھینچا تانی میں مبتلا ہے۔

جن کی دیگر مخلوقات میں مثال نہیں ملتی۔ اور اکثر ان میں سے واضح اور معروف ہیں۔

ایک غالب نوع کی حیثیت سے بھی انسان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ کیونکہ دیگر غالب انواع سیکڑوں اور ہزاروں انواع میں منقسم ہیں۔ پھر متعدد اجناس اور بڑے بڑے گروہوں میں جمع ہو گئی ہیں البتہ انسان نے اپنی سیادت کو بغیر تقسیم کے برقرار رکھا ہے۔ اور انسان کا نسلی تنوع ایک ہی نوع کی حدود میں محدود رہا ہے۔

غرض ارتقائی مرحلوں کے ترقی یافتہ حیوانات میں انسان کی کوئی مثال نہیں ہے۔

اپنی ارتقائی تاریخ میں منفرد ہونا بھی انسان کی حیاتیاتی خصوصیت ہے۔ اور ہم اب اس قابل ہیں کہ انسان کی ارتقائی انفرادیت کی تعریف کر سکیں۔

ایک غالب اور زندہ وجود کی حیثیت سے انسان کی جوہری خصوصیت یعنوی تفکیر ہے۔

اب تک ہم ارتقاء اور مقارنت کے لحاظ سے انسانی خصوصیات کو عمومی حیثیت سے زیر بحث لا رہے تھے۔ اب ہم ان خصوصیات اور ان کے نتائج پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

## انسان کی امتیازی خصوصیات

یہ امر ہماری توجہ سے دور نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ انسان وحیوان میں عقل کا فرق اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ہم عادتاً خیال کرتے ہیں۔ ہم حشرات کی جبلی قوت سے واقف ہیں۔ مگر حشرات نئے راستوں کی معرفت سے عاجز ہیں۔ پستان دار جانور بھی حشرات سے زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ مگر چونکہ انسانی فکر عادت کوشش اور غلطی پر نظر رکھتی ہے۔ اس لئے اسے عظیم حیاتیاتی اہمیت حاصل ہے۔ اصطلاحی طور پر تو بڑے تنگ دائرے میں حیوانات کا عمل ثابت ہے۔ مگر انسان نسبتاً آزاد ہے۔۔۔ اور لین دین میں بھی آزاد ہے۔۔۔ اس لچک کی زیادتی کے کئی نفسیاتی اثرات ہیں۔ جو فلسفۂ عقلی کے ماہرین بیان کرتے ہیں ۔۔۔ انسان ان میں سے بھی بعض میں منفرد ہے۔ اس لچک نے انسان کو ایسا یکتا جاندار بنا دیا ہے، جو نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے۔۔۔ اس کے باوجود جدید ترین آراء کے مطابق انسان میں اس کش مکش کو کم کرنے کے آلات موجود ہیں۔ جن کو ماہرین نفسیات کے یہاں اخفاء (suppression

اور بازداشت (Repression) کہا جاتا ہے۔

انسان کی یہ امتیازی خصوصیات جنہیں حیاتیاتی سے زیادہ نفسیاتی کہنا زیادہ مناسب ہے تین مندرجہ ذیل خصوصیات سے پیدا ہوتی ہیں۔

اول۔ انسان عام اور خاص فکر پر قدرت رکھتا ہے۔

دوم۔ انسان کے عقلی اعمال میں نسبتی وحدت ہے۔ جبکہ حیوان کے عقل وعمل میں فرق ہے

سوم۔ انسانوں میں قبیلہ، قوم، جماعت جیسی اجتماعی وحدتیں ہیں۔ اور انسان ان سے متعلقہ روایات وثقافت کے پابند ہیں۔

عقل کے ماقبل انسان سے انسان بننے تک ارتقاء حاصل کرنے کے بہت سے ثانوی نتائج ہیں۔ جو حیاتیاتی پہلو سے منفرد ہیں۔ ہم ان میں سے علوم ریاضی، موسیقی، فنی تخلیقات، مذہب اور مثالی محبت کا تذکرہ کرسکتے ہیں۔

اس موقع پر انسانی دلچسپی کے بعض پہلوؤں کا شمار کافی نہیں ہے۔ کیونکہ انسانی عمل کے متعدد پہلو اور اس کی خصوصیات اس کے اصلی خواص ہی کے ثانوی نتائج ہیں۔ اور اسی طرح وہ حیاتیاتی لحاظ سے منفرد بھی ہیں۔

انسان کی انفرادیت کے کچھ مزید پہلو ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو ابھی تک علم میں نہ آئے ہوں غرض انسان اپنے تمام احوال میں منفرد ہے۔"

کرسی مورلین اپنی کتاب

(Man does not stand alone)

میں۔ جس کا عربی میں ترجمہ محمود صالح فلکی نے "سائنس ایمان کی داعی ہے" کے عنوان سے کیا ہے کہتا ہے

"نظریۂ ارتقاء کے قائلین توارثی وحدات (GENE) سے ناواقف ہیں۔" (ص ۱۴۵)

"توارثی وحدات (GENE) ذرات کی اصغر ترین خوردبینی تنظیم ہیں۔ جو عام زندہ کائنات

کے وراثت کے خلیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو اصلیت، قدیم خواص اور تمام زندہ اشیاء کے خواص محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ ہر نباتات کے جڑوں، پتوں، تنوں، پھول اور پھل میں اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح یہ تمام حیوانات کی شکل، کھال اور بال و پر بناتے ہیں۔" (ص - ۱۴۷)

تمام زندہ کائنات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ جو حیوانات باہم مشابہ ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔

انسان تمام حیوانوں میں سرفہرست ہے۔ اس کی تخلیق سیمیا راور نگٹان، گوریلا اور چمپینزی کے مشابہ ہے۔ مگر یہ ہیکلی مشابہت اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ ہم سیمیائی نسل سے ہیں۔ یا یہ بندر انسان کی تنزل پذیر اولاد ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں خیال کر سکتا کہ بلاڈ مچھلی ہاڈک کی ارتقائی شکل ہے۔ حالانکہ دونوں پانی میں رہتی ہیں۔ ایک ہی غذا کھاتی ہیں۔ اور دونوں کی ہڈیاں مشابہ ہیں۔" (ص - ۱۴۲)

"بغیر ابتدائی ارادے کے مادی ارتقاء کے طریقہ پر حیوانی انسان کا مفکر اور اپنے وجود کا شعور رکھنے والے جاندار تک ارتقاء ایک عظیم اقدام ہے۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ انسان بالقصد وجود میں آیا ہے تو انسان کو ایک نظام کی حیثیت سے کون چلاتا ہے۔ کیونکہ اگر اسے چلانے والا نہ ہو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ اس نظام کو کون چلاتا ہے۔ اور نہ یہی کہتی ہے کہ وہ مادی ہے۔

## انسان میں اللہ کے نور کی کرن

ہم اس درجہ ترقی کر چکے ہیں کہ اب یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے نور کی کرن بخشی ہے انسان تخلیق کے لحاظ سے ابھی تک دورِ طفولیت میں ہے۔ اب کچھ کچھ انسان کو اس شے کا بھی شعور ہونے لگا ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ اس عطائے خداوندی کی طرف ترقی کر رہا ہے۔ اور اسے ہمیشہ رہنے والا محسوس کر رہا ہے۔

اگر یہ تعلیل صحیح سمجھی جائے۔ اور جس دلیل کا یہ سہارا لے رہی ہے اس کا ابطال ممکن بھی نہیں ہے تو ہماری اس چھوٹی سی سرزمین کو بڑی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ ہمارے علم کے مطابق ہماری

اس چھوٹی سی دنیا میں یہ پہلا وجود ہے جس میں اللہ کا نور موجود ہے۔ اور اسی نورانیت نے انسان کو حیوانی جبلّت سے نکال کر قدرت تفکیر بخش دی ہے۔ جس کی بدولت وہ تمام پیچیدگیوں کے باوجود کائنات کی عظمت اور مخلوقات میں پنہاں خالق کی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے۔

(ص ۱۸۷ - ۱۸۸)

"کسی جوہر (ATOM) یا کسی سالمہ (MOLECULE) کو کبھی فکر کی صلاحیت نہیں ملی۔ عناصر کے اتحاد سے کبھی کوئی رائے نہیں ابھری۔ کسی طبعی قانون نے کوئی کیتھڈرل (CATHE-DRAL) نہیں بنا دیا۔ مگر زندہ کائنات زندگی کے متعین محرکات کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔ اور زندہ کائنات کچھ اس طور پر منظم ہے کہ مادی جزئیات بھی اس کی تابع فرمان ہیں۔ اور اس کا نتیجہ وہ عجائبات عالم ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

آخر یہ زندہ کائنات ہے کیا؟ کیا یہ جوہروں اور سالموں سے عبارت ہے۔ جی ہاں۔ مگر کوئی اور بھی شے ہے۔ جو غیر محسوس ہے، مادے سے زیادہ اعلیٰ ہے اور ہر شے پر غالب ہے۔ اور ہر مادی شے سے اس قدر مختلف ہے کہ نہ اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کا وزن و قیاس ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کسی قسم کے قوانین اس پر حکمراں نہیں ہیں۔ بلکہ روحِ انسانی ہی اس کے انجام کی مالک ہے اور روح اپنے وجود کے مصدر اعلیٰ سے تعلق کا شعور رکھتی ہے۔ روح نے انسان کو قانون اخلاق عطا کیا۔ جو کسی اور حیوان کے پاس موجود نہیں ہے۔ اور نہ کسی حیوان کو ضرورت ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ انسان مادی تکوینیات کا نتیجہ ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ تجرباتی نلکی (TEST TUBE) میں انسان کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اس شخص کا قول بے دلیل ہے۔ روح بہرحال موجود ہے۔ جو اپنے اعمال اپنی قربانیوں اور مادے پر غالب ہو کر ظاہر ہے۔ اور خاص طور پر روح نے مادی انسان، بشری منفعت اور انسانی غلطیوں سے مرتفع کر کے اس کا تعلق اللہ کے ارادے سے قائم کر دیا۔ یہی اللہ کا مقصد ہے۔ اور یہی انسان کے اس پوشیدہ اشتیاق کی توجیہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے اعلیٰ اشیاء سے متصل ہونا چاہتا ہے۔ بلکہ یہی مذہب کا محرک بھی ہے۔ بلکہ روح ہی عین مذہب ہے۔" (ص ۲۰۱-۲۰۲)

اسلامی تصور بھی یہی بتاتا ہے کہ انسان اپنی طبیعت و ترکیب، اپنے کردار اپنے مقصد وجود اور اپنے انجام کے لحاظ سے اس ساری کائنات میں منفرد ہے۔ انسان ایک خاص با مقصد اور منفرد وجود ہے۔ اس کے ذمہ ایک فرض ہے۔ اور اس کا مقصد وجود متعین ہے۔ دنیاوی زندگی اس کے لئے امتحان ہے۔ جس کے ذریعہ میں اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔ اور یہی اعمال اس کا انجام متعین کریں گے۔

ہم یہ تمام امور قصہ آدم میں پاتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ۔ ۳۰)

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو۔ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (ص۔ ۷۱-۷۲)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (اسراء۔ ۷۰)

یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین۔ ۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ (الذاريات ۵۶)

ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاتَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الملک-۲)

وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہارا امتحان لے۔ کہ کون تم میں بہتر عمل کرنے والا ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى۔

(طٰہٰ۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴)

تو جو شخص میری ہدایت کی اتباع کرے گا وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں شقی ہوگا۔ اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا۔ تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا کرکے قبر سے اٹھائیں گے۔

## انسان۔ ایک پیچیدہ وجود

انسان ایک انتہائی پیچیدہ وجود ہے۔ انسان اپنی عضوی عقلی اور روحانی ترکیب میں اسی طرح پیچیدہ ہے جس طرح وہ اپنے مختلف اعمال میں پیچیدہ ہے۔ آج تک ان کی طبیعت اور ان کے درمیانی روابط کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ صرف ظاہری اور سطحی مطالعہ ہی ممکن ہے۔

یہ پیچیدگی صرف انسان کے کلی وجود ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ پیچیدگی اس کے ان گنت خلیوں میں سے ہر خلیے میں موجود ہے۔

آج تک کوئی خلیہ کی ساخت کے راز سے پردہ نہیں اٹھا سکا۔ اگر اس کے مادی عناصر تکوین کا علم بھی ہو جائے تو اس کا عنصر حیات کی کنہ و کیفیت بہر حال نامعلوم ہے اور نامعلوم رہے گی۔

زندہ خلیہ کی معرفت کے طویل سفر میں جو معلومات ہوئی ہیں وہ بالکل ابتدائی ہیں۔ کہ خلیہ اپنا کردار اس طرح انجام دیتا ہے جیسے وہ پوری طرح عقل و شعور کا مالک ہو۔ خلیہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ

اس کا دوسرے خلیوں کے ساتھ کیا کردار ہونا چاہیئے۔ وہ اپنے سارے عمل کو بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح انجام دیتا ہے کہ عقل انسانی بھی ایسا نہیں کر سکتی!

ان تمام اسرار اور انسانی وجود کے مرکبات کے درمیان روابط کے اسرار کے بارے میں ڈاکٹر الکسیس کارل گفتگو کرتا ہے۔ جسے ہم پہلے باب میں نقل کر آئے ہیں۔ یہاں چند جملے دوبارہ زیر نظر لاتے ہیں۔

فی الحقیقت ہم بڑی گمبھیر جہالت میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ نوع انسانی کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے جو عام سے سوالات آتے ہیں ان کا بھی کوئی جواب نہیں مل پاتا۔ کیونکہ ہماری باطنی دنیا کے لامحدود پہلو ابھی تک نامعلوم ہیں۔ ہم ابھی تک اس قسم کے متعدد سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہیں۔

مرکب اور وقتی خلیوں کے اعضاء بنانے والے کیمیائی مواد کے اجزاء کیونکر متحد ہوتے ہیں؟

توارثی عناصر (GENE) حامل بیضہ میں اس سے مشتق ہونے والے فرد کی صفات کو کیونکر جاگزیں کرتے ہیں؟

خلیے کس طرح خود بخود جمع ہو کر اعضاء اور نسیں بن جاتے ہیں؟ کیونکہ خلیوں کو بھی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح پہلے ہی سے معلوم ہے کہ انھیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ اور بسیط وجسم کے پوشیدہ میکانکی عمل میں کس طرح مدد دیتا ہے۔

نفسیاتی اور عضویاتی حیثیت سے ہمارا تکوینی مزاج کیا ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نسوں، اعضاء ملتحات اور شعور سے مرکب ہیں۔ مگر شعور اور مخ کے درمیانی روابط ابھی تک ناقابل فہم گتھیاں ہیں۔

ہمیں عصبی خلیوں کی عضویت کے بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ارادہ کس حد تک جسم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عقل اعضاء کی حالت سے کیونکر متاثر ہوتی ہے۔ عقلی اور عضوی خصوصیات جو ہر فرد کو وراثت میں ملتی ہیں۔ کس طرح زندگی کے طریقہ کار، کھانے اور آب و ہوا میں موجود کیمیاتی اجزاء اور نفسیاتی اور ادبی نظام کے بدل جانے سے بدل جاتی ہیں؟"

انسانی ترکیب اس کے وظائف اور اعمال کی یہ پیچیدگی۔ اس کے اصل کردار یعنی زمین میں

خلافت کے فرض کی عظمت اور اپنے تخلیقی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ (ص۔ ۷۱-۷۲)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں۔ اور اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔

یہ وجود جو غبار خاکی اور نفخۂ روحانی سے وجود میں آیا ہے۔ حالانکہ روح و خاک کے درمیان بڑے وسیع آفاق موجود ہیں۔ اسی وجود میں ایسی پیچیدگی متصور ہو سکتی ہے جو عقل انسانی کی گرفت سے باہر ہو۔ کیونکہ یہ عقل سے برتر اور عظیم تر ہے۔ جب کہ اس وجود کی تخلیق اللہ کے لئے بالکل آسان ہے

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (النجم۔ ۳۲)

وہ تم کو اور تمہارے احوال کو اس وقت سے خوب جانتا ہے۔ جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا، اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الملک۔ ۱۴)

اور بھلا کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ اور وہ باریک بیں اور پورا باخبر ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق۔ ۱۶)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

## ہر انسان منفرد اور بے مثال

اس کے علاوہ انسان کا ہر فرد بذات خود دیکھتا اور منفرد عالم ہے۔ اور کسی فرد کی کوئی

دوسری مثال نہیں ہے۔ جبکہ تمام افراد میں مشترک انسانی خصائص بھی موجود ہیں۔
اس صورت حال سے معاملہ زیادہ پیچیدہ اور انسان کا مطالعہ زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔
اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جنس بشری کی عضوی اور نفسیاتی ترکیب کی معرفت سیکڑوں سالوں بعد حاصل ہو جائے گی۔ تو بھی ہر فرد کی امتیازی خصوصیات کی مکمل معرفت ناممکن ہے۔

اس انفرادیت کے بارے میں ڈاکٹر کاریل کہتا ہے:

انفرادیت انسان میں جوہری ہے۔ یہ صرف ہمارے جسم کا ایک معین پہلو نہیں ہے بلکہ انفرادیت ہماری ذات کے اندر تک سرایت کئے ہوئے ہے۔

انفرادیت ذات کو تاریخ عالم میں منفرد بنا دیتی ہے۔ اور جسم و شعور پر ایسی چھاپ لگا دیتی ہے جیسے ہر مرکب پر اپنی مخصوص چھاپ ہوتی ہے۔ اگرچہ انفرادیت کہیں نظر نہیں آتی" (ص ۲۸۱)۔

"چہروں کے نقوش، اشارات، چلنے پھرنے کے انداز اور مخصوص عقلی اور ادبی خصوصیات کی بناء پر افراد ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اگرچہ گردش زمانہ سے افراد کے بہت سے مظاہر میں تغیرات ہوئے ہیں۔ مگر وہ اپنے ہیکل کے بعض معین اجزاء کے ابعاد سے پہچانے جاتے ہیں (جیسا کہ برٹون کہتا ہے)۔ اسی طرح انگلیوں کی پوروں کی لکیریں فرد کی قطعی طور پر امتیازی خصوصیت اور انگلیوں کے نشانات ہی لوگوں کے اصلی دستخط ہیں۔ (ص ۲۸۲)۔

"بہرحال جلد کی ساخت نسوں کی انفرادیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ خود نسوں کی انفرادیت کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے لگائیے۔

ایک زخمی کھال کی سطح پر کھال کا پیوند لگایا گیا۔ اس طرح سے کہ تھوڑی سی کھال خود مریض کے جسم سے لی گئی۔ اور تھوڑی سی دوسرے کے جسم سے۔ چند ایام بعد دیکھنے میں آیا کہ جو کھال خود مریض کے جسم سے لی گئی تھی۔ وہ زخم کے ساتھ جڑ گئی ہے اور اس میں زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔ اور جو کھال کسی دوسرے سے لی گئی تھی وہ سکڑ گئی ہے اور اس میں جھریاں پڑ گئی ہیں۔ غرض جلد ہی

مریض کی اپنی کھال درست ہوگئی اور دوسرے کی کھال خراب ہوگئی۔ (ص ۲۸۳)۔

"اصول یہ ہے کہ کسی شخص کی نسیں دوسرے شخص کی نسوں کو قبول نہیں کرتیں... جب رگیں سی دی جاتی ہیں۔ اور خون دوبارہ پیوند شدہ گردہ میں سے گزرنے لگتا ہے۔ تو پیشاب ٹھیک ٹھیک آنے لگتا ہے۔ اور گردہ کا عمل طبعی محسوس ہوتا ہے۔ کچھ ہفتے گزرنے کے بعد رطوبت ظاہر ہوتی ہے اور پھر پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔ جلد ہی سوزش گردہ کی شکایت ہوجاتی ہے اور گردہ کمزور ہوجاتا ہے.... مگر اگر پیوند کا عضو خود اسی جاندار میں سے لیا جائے تو وہ اپنا عمل بہتر طریقہ پر انجام دیتا رہتا ہے۔ کیونکہ اخلاط اجنبی نسوں کے مخصوص ترکیبی اختلافات کو اس طرح عیاں کر دیتے ہیں کہ ان کا اس طرح عیاں ہونا کسی بھی تجربہ سے ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص کے اپنے مخصوص خلیے ہوتے ہیں۔ اور یہی چیز علاجی مقاصد میں اعضاء کی وسیع پیمانہ پر پیوند کاری میں حارج بنی ہوئی ہے۔" (ص ۲۸۳)

مرکب جسم کے تمام اجزاء پر انفرادیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے خواہ عضویاتی اعمال ہوں یا اخلاط اور خلیوں کی کیمیاوی ترکیب، ہر جگہ انفرادیت موجود ہے۔ اسی لئے خارجی دنیا (شور و خطر، کھانا، سردی، جراثیم اور دیرس کا حملہ) سے ہر شخص کا برتاؤ جداگانہ اور مخصوص نوعیت کا ہوتا ہے۔" (ص ۲۸۶)

"عقلی، ترکیبی اور اخلاطی انفرادیتیں، کسی نامعلوم طریقہ پر باہم ہم آہنگ ہوجاتی ہیں۔ اور ان میں سے ایسے روابط ہوتے ہیں۔ جیسے عضویاتی اور ذہنی اعمال اور عضوی وظائف میں ہوتے ہیں اور اس طرح یہ ہمیں انفرادیت بخشتے ہیں اور ہر انسان کو ایک جداگانہ حیثیت دے دیتے ہیں" (ص ۲۸۷)

"ہر فرد سمجھتا ہے کہ وہ منفرد ہے۔ اور یہ انفرادیت ایک حقیقت ہے۔" (ص ۲۸۹)

"عضویاتی انفرادیت کی مکمل تلاش و جستجو اور اس کے مرکب اجزاء کا قیاس ابھی تک ممکن ہے۔ بلکہ ہم اس انفرادیت کی بالکل تحدید بھی نہیں کرسکتے کہ فرد واحد دوسرے فرد سے کیوں مختلف ہے۔ بلکہ ہم کسی مخصوص شخص کی جوہری صفات کی دریافت سے بھی عاجز ہیں۔ چہ جائیکہ اس کے امکانات کی دریافت!" (ص ۲۹۰)

"نفسیات اسی لئے اب تک سائنس نہیں بن سکی. کیونکہ انفرادیت اور اس کے امکانات ابھی تک قابل قیاس نہیں ہیں" (ص ۲۹۱).

## مطلوبہ ضابطۂ حیات خدا ہی وضع کرسکتا ہے

تین بنیادی حقیقتیں ہیں ۔ انسان اس کائنات میں یکتا وجود ہے ۔ انسان بہت پیچیدہ وجود ہے ۔ اور انسان کی انفرادی دنیا میں علیحدہ ہیں جن کی تعداد خود افراد انسان کے برابر ہے۔

یہ حقیقتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسا ضابطۂ حیات ہو جس میں ان تمام امور کی رعایت ہو. یہ انسان کی طبعی اور ترکیبی انفرادیت کو بھی مدنظر رکھے، یہ انسان کے عمل اس کے مقصد وجود اور اس کے انجام کی انفرادیت کی بھی رعایت کرتا ہو. یہ انسان کی انتہائی پیچیدگی، اس کے اعمال کے تنوع اور ان کے پیچیدہ روابط کو بھی محیط ہو. اور انسان کی اس انفرادیت کی رعایت اس کی اجتماعیت کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہو۔

اس کے بعد یہ ضابطۂ حیات اس امر کی بھی ضمانت دیتا ہو کہ انسان کی تمام دلچسپیاں اس کی طاقت کے مطابق روبکار آسکیں گی. اس طرح کہ نہ کوئی فرد کچلا جائے اور نہ اسراف وافراط کا شکار ہو۔ اور نہ کوئی قوت دوسری قوت پر زیادتی کرے اور نہ ایک عمل دوسرے عمل کو ختم کرے پھر ہر شخص کو اس امر کی گنجائش ہو کہ وہ جماعت کا ایک حصہ ہوتے ہوئے اپنی اصل انفرادیت کو بھی روبکار لاسکے۔

مگر چونکہ ہم انسان سے ناواقف ہیں۔ اس لئے جس قدر بھی ضابطۂ حیات انسانیت نے اپنائے ہیں ان میں سے کسی میں بھی ان تمام متنوع اور گوناگوں۔ مختلف اور پیوست۔ پہلوؤں کی رعایت نہ ہوسکی۔ اور ایسا ہونا بالکل طبعی تھا۔

ایک واحد ضابطۂ زندگی جس میں ان تمام پہلوؤں کی رعایت ہے۔ وہ ہی ہے جو خالق انسان نے وضع فرمایا ہے۔ جو انسان کی ساخت اور فطرت سے واقف ہے۔ جو انسان کی قوتوں اور اس کے

اعمال سے باخبر ہے اور جو اس امر پر قادر ہے کہ انسان کے لئے ایک ایسا ضابطۂ حیات مقرر کرے جس سے انسان کا مقصد وجود بھی پورا ہو جائے اور اس کے تمام اعمال میں توازن پیدا ہو جائے اور اس کی اجتماعیت اور انفرادیت متحقق ہو جائے۔

ضابطۂ حیات کا مسئلہ اس قدر دقیق، خطرناک، پیچیدہ اور گتھا ہوا ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے الٰہی علم و حکمت اور عدل و انصاف ناگزیر ہے —— اور اس کام کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ [1]

اب ہمیں ذرا یہ دیکھنا چاہیئے کہ جب انسان اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنی خواہشات کا بندہ بن گیا تو وہ کس طرح بھٹکتا رہا۔ اور اس کا اپنے بارے میں نظریہ کن انقلابات سے دوچار رہا۔

## انسان کی حیثیت کا تاریخی جائزہ

یونانی دیومالا میں انسان دیوتاؤں کا حریف تھا۔ وہ دیوتاؤں سے اقتدار اور علم کے حصول کے لئے لڑتا رہا۔ دیوتا بجبر و قوت اسے قبضے میں کئے ہوئے تھے۔ مگر وہ ان کے سامنے جھکنے اور سرنگوں ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ پھر جب انسان کو دیوتاؤں کے مقابلہ میں فتح حاصل ہو گئی، تو بھی اس کے دل میں ان کی طرف سے غصہ اور نفرت بھرا رہا۔!

جب رومی دور آیا جو تہذیب جدید کی اصل بنیاد ہے — تو دیوتاؤں کا سایہ ہٹ گیا اور انسان اپنی ذات اور خواہشات کا غلام بن گیا۔ اب اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ دیوتا اس کی دنیاوی زندگی میں کوئی دخل دیں۔ بس دیوتاؤں کا اس قدر حصہ رہ گیا تھا کہ کاہن ان کے ذریعے پیش آمدہ واقعات بتا سکیں۔ اس طور پر دیوتاؤں کا وجود ایک بے ضرر سی سماجی روایت بن گیا تھا۔ البتہ اگر ان دیوتاؤں کا کوئی میلہ ہوتا۔ تو رومی دستور کے مطابق خوب خوب دادِ عیش دیتے۔

پھر جب رومی حکومت پر کلیسائی نصرانیت کا غلبہ ہوا تو انسان کو پیدائشی گنہ گار ٹھیرا کر

---

[1] میں اس موضوع پر اپنی کتاب "اسلامی تصور کی خصوصیات" میں "حقیقت انسان" کے زیر عنوان اور "اسلامی معاشرہ" میں "انسانی نظام" کے تحت تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔

ذلیل و خوار کر دیا گیا۔ انسان کی یہ ذلت و رسوائی ان مجسموں اور دوسرے وسائل تعبیر سے نمایاں ہے۔ جو انسان کے بارے میں اس نظریئے کے زیر سایہ اختیار کئے گئے۔

اگرچہ انسان کے بارے میں نصرانی نظریہ میں اللہ کی تکریم کا عنصر شامل تھا، مگر کلیسا نے لغزش آدم کو جو رنگ دیا ہے اس سے انسانیت گناہ میں ملوث ہو گئی۔ حتی کہ مسیح: انسان کا بیٹا مسیح۔ خدا اور بیٹا آیا۔ اور اس نے انسانیت کی اس لغزش کا کفارہ ادا کیا۔ مگر یہ کفارہ بھی انسان کو سربلند نہ کر سکا۔ بلکہ انسان کو ذلت و بے کسی، تقشف اور پوری زندگی کے عذاب سے کفارہ دینا پڑا تاکہ وہ مسیح سے مل کر مغفرت حاصل کرے۔

انسان کے فطری میلانات اور اس کے جنسی روابط کو گندگی، نجاست اور رجس اور اس کے شعور ذات کو گناہ اور خطا قرار دیدیا گیا۔ اس نظریہ کے پس پردہ رہبانیت اور رہبانیت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل کا ایک طویل سلسلہ تھا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

اور جب فی الواقع ردعمل شروع ہوا۔ اور یورپ نے کلیسا، کلیسائی تصورات اور تمام مذہبی مفاہیم سے بغاوت کر دی۔ تو اس انقلاب کے ساتھ ساتھ انسان کے بارے میں نقطہ نظر بھی بدل گیا اور انسانی عقل اس کا مرجع بن گئی۔

اٹھارھویں صدی کے نصف میں جب روشن دور شروع ہوا تو عقل خدا بن گئی۔ ساری خارجی دنیا عقل کی کارستانیوں کا مظہر قرار پائی۔ اور اسے یہ حق مل گیا کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حکمرانی کرے اور اسی کی رائے آخری اور قطعی سمجھی جائے۔ یہیں سے انسان کو پوری پوری آزادی مل گئی۔ اور کسی غیر انسان کی کوئی قدغن باقی نہ رہی۔ اسی روشن دور میں مذہب کو زندگی سے خارج کر دیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے ختم پر یہ روشن دور بھی ختم ہو گیا۔ اور انیسویں صدی نے موضوعی فلسفہ پیش کر کے عقل اور انسان دونوں کا قصہ ختم کر دیا۔ موضوعی فلسفہ نے بتایا کہ مادہ ہی خدا ہے مادہ ہی عقل کو پیدا کرتا ہے۔ اور انسانی احساسات میں وہ امور منطبع کر دیتا ہے۔ جو اس کے خیال میں درست ہوتے ہیں!

اب عقل بھی پس پردہ چلی گئی۔ اور انسان بھی۔ اب انسان نہ اپنا الٰہ رہا۔ نہ کسی اور شے کا
اب تو انسان خود طبیعت کی مخلوق اور الٰہ طبیعت کا بندہ بن گیا!

اس کے بعد ڈارون آیا۔ اس نے دو کتابیں "اصل الانواع" ۱۸۵۹ء اور "اصل انسان" ۱۸۷۱ء
شائع کیں۔ اور انسان کی حیوانیت کا اعلان کر دیا۔

مذہب نے انسان کو جو عزت، انفرادیت اور خصوصیت بخشی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور
روشن دور میں فلسفہ نے جو ایجابیت، استقلال اور غلبہ عطا کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اور انسان
دوسرے تمام حیوانات کی طرح ایک حیوان بن گیا۔ رہ گیا جو غلبہ آج انسان کو حاصل ہے سو وہ کسی
وقت اپنے ارتقائی دور میں بلی اور چوہے کو بھی مل سکتا ہے جیسا کہ جولیان ہکسلے بتاتا ہے۔

رہی سہی کسر فرائڈ[1] اور کارل مارکس[2] نے پوری کر دی۔ فرائڈ نے انسان کے تمام فطری حرکات
کو جنس سے منسوب کر کے انسان کو جنس کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اور مارکس نے تاریخ کے تمام

---

[1] سگمنڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD 1856-1939) آسٹریا کا یہودی النسل ماہر نفسیات جو اعصابی امراض کو شعور اور لاشعور کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اس نے جو طریقہ علاج دریافت کیا۔ وہ تحلیل نفسی کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو فرائڈ لندن چلا گیا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ (س صدیقی)

[2] کارل مارکس (KARAL MARX 1818-1883) جدید اشتراکیت کا بانی، جرمنی میں پیدا ہوا۔ فلسفہ میں پی۔ ایچ ڈی کیا۔ ابتدا میں ہیگل کا حامی تھا ۱۸۴۳ء میں پیرس چلا گیا۔ وہاں انگلز سے ملاقات ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں پیرس سے نکال دیا گیا۔ تو بلجیم چلا گیا۔ انگلز کے ساتھ مل کر اپنا منصوبہ "اشتراکی منشور" (communist Menifesto) کے نام سے پیش کیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے مزدوروں کی پہلی انٹرنیشنل کمیونسٹ انجمن قائم کی۔ زندگی کے آخری برسوں میں اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" (capital) تصنیف کی۔ (س۔ صدیقی)

تغیرات کو معاش کے گرد گھمادیا۔ اور انسان کو ایک کمزور دنیلبی مخلوق بنا کر خداوند اقتصاد اور ذرائع پیداوار کے دیوتا کے سامنے سرنگوں کر دیا۔

٭ ٭ ٭

یوروپ میں انسان کا تصور" کبھی ایک مقام پر قائم نہیں رہا۔ اور نہ کبھی اس تصور میں اعتدال پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں زندگی کے نظام اور حالات انفرادی عمل اور معاشرے کی عام روش ہمیشہ ہی گمراہی اور اضطراب سے دوچار ہے کیونکہ تصور انسان اور زندگی کے عمل واقعی کو جدا جدا نہیں کیا جاسکتا۔

فکر کی یہ بے راہ روی انسانی عمل سے متعلق نقطہ نظر میں بھی موجود تھی۔ کہ فطری میلانات، صلاحیتوں اور استعداد کے بارے میں انسان کا رویہ کیا ہو۔ اور معاشرے کے وہ پسندیدہ اخلاق جو معاشرے کے افراد کے اعمال ایک خاص سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اس اخلاق کے ساتھ انسان کیا برتاؤ کرے۔

غرض یوروپ ہمیشہ ہی افراط و تفریط میں مبتلا رہا۔ کبھی خواہشات کو کچلا گیا۔ اور کبھی بے راہ روی اختیار کی گئی۔ کبھی فطری میلانات اور طبعی قوتوں کو پامال کیا گیا۔ اور کبھی انھیں بے لگام چھوڑ دیا گیا۔ یوروپ نے اپنی طویل تاریخ میں نہ کبھی راہ اعتدال اپنائی۔ اور نہ کسی وقت اسکے تصورات اور اس کی زندگی میں توازن پیدا ہوا۔

## اہل روما کی عیش پسندی

ہم یوروپ کی واقعی صورت حال رومی دور سے پیش کرتے ہیں۔ امریکی مصنف ڈاکٹر ڈریپر اپنی کتاب معرکۂ مذہب و سائنس میں نصرانیت کے داخلہ سے پہلے کی رومی حکومت کا نقشہ کھینچتا ہے۔

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما منتہائے ترقی پر فائز ہو گئی تو تہذیبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے آخری درجہ کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روما کی عیش پرستی اور عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کو

ایک سلسلۃ العیش بنا دے۔ پاک بازی حظ نفس کے خوانِ نعمت پر ممتاز نمکدان ہے۔ اور اعتدال سلسلۂ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ ان کے دستر خوان سونے چاندی کے پانی سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے۔ ماہر دیانِ روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں۔ ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں۔ عالی شان حماموں، دل کشا تماشا گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے۔ جب تک کہ حریفوں میں سے ایک خاک و خون میں نہ سو جائے۔ اہل روما کے سامانِ تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربے کے بعد یہ بات معلوم ہوتی تھی۔ کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو تجارت و محنت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال اور املاک کی ضبطی صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص، زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے۔ اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔ بغرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی۔ لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونانِ عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔" [۱]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دور کے رومی معاشرے کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت اور عریانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لئے ضروری ہو گئیں قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب کہ قیصر ٹائبیریس (۱۴ء ۔ ۳۷ء) کے عہد میں معزز

---

[۱] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ (ص ۲۴۸ - ۲۴۹)

خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لئے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ فلورا (FLORA) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا۔ کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے بر سرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کئے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہ ہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ اور کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔" سلہ

## عیسائیت۔ رہبانیت

پھر پولیس کی تشکیل دی ہوئی عیسائیت رومی حکومت پر قابض ہو گئی اور ۳۱۳ء میں کانسٹنٹائن تخت پر جلوہ فروز ہو گیا اور رومن سلطنت میں اسی کے نام کا سکہ چلنے لگا۔

اس دور کی تصویر ڈریپر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنہیں مذہب کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی اور بباطن مشرک وبت پرست تھے۔ لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین نے کہ وہ بھی انہی کا ہم مشرب تھا۔ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرزِ عمل کا سدِ باب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔"

"اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے گون کا سمجھا اُسے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے۔

---

سلہ "پردہ" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۲۱۰۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز۔ لاہور

اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی اور عیسائیت پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارے میں یہ بڑا فرق ہے کہ اسلام نے اپنے مد مقابل کو مطلق نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا۔ اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے۔ اپنا ذاتی فائدہ، سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مسیحی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی۔ اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا" [1]

یہ بت پرستانہ عیسائیت۔ رومیوں کو اس حیوانی زندگی سے تو نہ نکال سکی جو وہ دور بت پرستی سے گزارتے آ رہے تھے۔ البتہ اس کی دوسری انتہا رہبانیت کو اختیار کر لیا۔ جس نے فطری میلانات، طبعی قوتوں اور تعمیر و خلافت — کے انسان کے اساسی کردار کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس رہبانیت سے یہ تو نہ ہو سکا کہ انسانی وجود کی گہرائیوں میں اتری ہوئی زبردست قوتوں کو بالکلیہ ختم کر دیتی۔ البتہ اس نے زندگی کو محرکات اور ضوابط کی کشاکش میں مبتلا کر دیا۔ اور انسانی ضمیر ایک الم انگیز کشمکش اور اجتماعی اور عمرانی زندگی تباہی سے ہمکنار ہو گئی۔

لیکی اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ میں بیان کرتا ہے:

"راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مؤرخین کے اختلاف بیان کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جا سکتی۔ تاہم ان کی کثرت اور رہبانیت کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے۔ سینٹ جروم کے زمانے میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی (ص ۲۵۱-۲۵۲)

ہوتا تھا۔ چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے۔ سینٹ سیرا پین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے۔ اور چوتھی صدی کے خاتمے پر تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی۔"

لیکی نے راہبوں کی حالت بیان کی ہے۔ اور ان کے انسانی فطرت سے دور ہونے اور زندگی سے فرار میں مبالغہ اور فطرت کے مقابلہ کی تفصیل بتائی ہے۔ اس کا کچھ خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔ مورخین نے اس کی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں۔ سینٹ میکر ویس اسکندروی کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دل دل میں سویا کئے۔ تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ ان کے مرید سینٹ یوسیلیس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے۔ اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے۔ ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحے کے لئے بھی بیٹھے نہ لیٹے۔ جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے۔ بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیروں کے بل چلتے تھے۔ راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے۔ اہل زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا۔ جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبہ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمہ عفونت و غلاظت ہوتے سینٹ اینتھنس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انٹونی یا این کبرسنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیان کا مرتکب نہیں ہوا۔

سینٹ ابراہام نے اپنی پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ

پڑنے دی۔ راہب الگزنڈر بڑے تاسف اور تحیر سے فرماتے ہیں۔ کہ وہ ایک زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں جو حمام جایا کرتے ہیں۔ راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے۔ اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقے میں شامل کرتے تھے۔ والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ جو اولاد انھیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی۔ اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف واہ واہ ہوتی تھی۔ پہلے جو اثر واقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا اغوا کرتے تھے۔ سینٹ امبیروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھروں کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی وجوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے۔ مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی صاف گوئی نیاضی، شجاعت جرأت کہ عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشیات کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزاء کا احترام وادب کافور ہو گیا۔ اس زمانے میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزاء کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زاہدان صحرا اور عابدان مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے۔ بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے۔ اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے والی وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں پر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کا مقصود زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اُخروی حاصل ہو انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین ومتوسلین جئیں یا مریں۔

لیکی نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر آج بھی آنسو نکل آتے ہیں۔

عورتوں کے سائے سے وہ بھاگتے تھے۔ ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ یا گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد وریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے اپنی ماؤں، بیویوں، اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے۔ لیکی نے اس

سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا۔ [1]

اب دیکھیے اس نفرت دشمنی اور میلانات اور فطری صلاحیتوں کے انسانی وجود سے اکھاڑ پھینکنے کے کیا نتائج سامنے آئے؟

یہ سرکش انحراف کامیاب نہیں ہوا۔ بلکہ فطرت ہی غالب آکر رہی۔ اور اس انتہا پسند رہبانیت نے رومیوں کی مادیت کے غلو اور ان کی بہیمانہ خواہشات پرستی میں کچھ اعتدال و تخفیف پیدا نہ کر سکی۔ بلکہ دونوں کے فساد نے مل کر ساری زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

لیکی مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"اخلاق رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی۔ بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زاہد و راہبین پیدا ہوئے۔ وہ وہی تھے۔ جن میں عیش پرستی اور بدخلقی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا۔ جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی اور رسوائی کا مطلق خوف باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغا بازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی۔ جو قیاصرہ کے زمانے میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم و تشدد و شقاوت و بے حیائی اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریت فکر آزاد خیالی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔" [2]

※ ※ ※

اس وقت تو یورپ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ جب کلیسا نے اپنی غلط علمی آراء

---

[1] بحوالہ سابق (ص ۲۵۳ - ۲۵۵)

[2] بحوالہ سابق (ص ۵۲ - ۵۹)

خرافات اور دیومالا کو عقیدہ کا جزء قرار دیا۔ اور اس خرافات سے کلیسا نے اس تجربی اسکول کا مقابلہ کیا جو اسلامی درسگاہوں سے شائقین یورپ تک پہنچا تھا۔ اور ان علمی نتائج کے مد مقابل بن گیا جو اس تجربی اسکول سے حاصل ہوئے تھے۔ اور علماء یورپ جن تک رسائی حاصل کر چکے تھے ۔ کلیسا نے سائنس دانوں کو زندہ آگ میں جلایا۔ اور ان کے طریقہ کار اور ان کے تجربات کے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہی قیامت تھی جو یورپ پر ٹوٹی۔ اور جس کے نتیجہ میں سائنس دان اور ان کے ساتھ سارا یورپ کلیسا کا دشمن ہو گیا۔ اور دشمنی و عداوت حد اعتدال سے گزر گئی۔

اس وقت کے نظریات او وسائل کے ساتھ ساتھ انسان کی تذلیل و تحقیر کا جذبہ بھی کار فرما رہا اور اسی جذبہ کے زیر اثر خسیس ترین شہوتوں کو بھی بغیر کسی حد اور بغیر کسی قید کے مباح قرار دیدیا گیا۔

یہ سیلاب تا حال سرکش لہریں لیتا چلا آرہا ہے۔ یہ سیلاب۔ جو ابتداءً یورپ سے یورپ نژاد امریکہ پہنچا اور وہاں سے تمام روئے زمین پر پھیل گیا۔ اور اب تک تباہیاں پھیلا رہا ہے۔

صحافت، سینما، ڈرامہ، ادب، مصوری، سنگ تراشی اور دیگر فنون اس طوفان بے حیائی میں مزید صور پھونک رہے ہیں۔ اور ان سب کے پس پردہ اصل محرک حکماء صیہون کا لائحہ عمل (پروٹوکول) ہے جو بتاتا ہے کہ فی الحقیقت صیہونیت کا مقصد ہی یہ ہے کہ غیر یہودی دنیا کو اباحیت کا شکار بنا کر تباہ کر دیا جائے تاکہ ان کو صیہونی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنا آسان ہو۔!

انسانیت بڑی تیزی سے ہولناک تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ زندگی کی دوڑ مجنونانہ روش اختیار کر چکی ہے اور متعدد اسباب مل کر اس حرکت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں ۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس بھٹکی ہوئی مدہوش اور مجنونانہ قیادت سے ہٹ کر انسانیت کی قیادت کوئی اور قوت سنبھال لے۔

# "عورت اور صنفی روابط"

جس طرح انسان اور اس کی فطرت کے بارے میں یوروپ کا نقطہ نظر ہمیشہ بگاڑ کا شکار رہا ہے۔ اسی طرح عورت اور صنفی روابط کے بارے میں بھی وہ ہمیشہ بے راہ روی اختیار کئے رہا۔ یہاں بھی افراط اور تفریط اور دو انتہاؤں کے درمیان سخت کشمکش جاری رہی۔ اور دونوں انتہاؤں کے درمیان کھچاؤ اور تناؤ میں کبھی اعتدال اور تناؤ پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی یہ مسئلہ ان کے یہاں کبھی فطرت سے ہم آہنگ ہوا۔

عورت اور صنفی روابط کے بارے میں غلط نقطہ نظر سے پیدا ہونے والی بے راہ روی اور اضطراب، اس بے اعتدالی اور اضطراب سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ جو انسان اور اس کی فطرت کے بارے میں غلط نکتہ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں خرابیوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی اس وجود کی دونوں صنفوں کی حقیقت سے ناواقفیت، ضعف و ہوائے نفس اور اللہ کی ہدایت سے روگردانی!

عورت اور صنفی روابط کے مسئلے میں بھی وہ تمام مقدمات مد نظر رکھنا چاہئیں۔ جو ہم انسان اور اس کی فطرت "کے زیر عنوان بیان کر آئے ہیں۔ کیونکہ وہ پوری طرح یہاں بھی منطبق ہوتے ہیں اس لئے اس موضوع میں آگے بڑھنے سے پہلے گزشتہ صفحات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

گزشتہ مقدمات میں اس حقیقت کا بھی اضافہ کر لیجئے کہ اگر صنفی روابط دو انتہاؤں کے درمیان متحرک رہتے ہیں اور ان کی بنیاد جہل ضعف اور ہوائے نفس ہو تو انسانی زندگی کبھی بھی

مستقیم، معتدل اور مطمئن نہیں ہو سکتی۔

صنفی تعلق تمدن، اقتصاد اور تقسیم دولت کی بنیاد ہے اور اسی تعلق پر انسانیت کے وسیع اور گوناگوں پہلوؤں میں اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے۔ صنفی تعلق اور اقتصادی تعلقات کے بارے میں نقطۂ نظر تصور انسان کا ایک حصہ ہے۔

تصور انسان کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بقدر ضرورت بیان کر چکے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے مزید تشریح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

## عورت کے مقام کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم، اسلام ۔ عورت کے بارے میں نقطۂ نظر کو درست کرتا اور صنفی تعلق کو نظری حقائق کی بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ پھر اس تعلق کے تمام نفسیاتی اور عملی پہلو بیان کرتا ہے۔ تاکہ نہ کہیں اضطراب اور عدم استقلال رونما ہو اور نہ مسئلہ کے کسی پہلو میں کوئی اخفاء باقی رہے۔

چنانچہ اسلام سب سے پہلے عورت اور مرد کو انسانیت کے لحاظ سے مساوی اور ایک وحدت قرار دیتا ہے۔ تاکہ وہ تمام غلط نظریات ختم ہو جائیں۔ جو عورت کو مرد سے گری ہوئی مخلوق بتاتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔

(النساء ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا ایک جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

پھر اسلام بتاتا ہے کہ زوجین اپنے رب سے تعلق اور اس سے بدلہ لینے کے لحاظ سے بھی آپس میں مساوی اور ایک وحدت ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ

(آل عمران ۱۹۵)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں. خواہ مرد ہو یا عورت. تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو.

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِیْنَ وَ الصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِیْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذَّاکِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۔

(الاحزاب ۳۵)

بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں. مومن ہیں. مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں. اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں۔

روزہ رکھنے والے ہیں. اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں. اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں. اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

اس کے بعد اسلام نفس واحد کے دونوں حصوں میں تعلق اور اس تعلق کے مقاصد بیان کرتا ہے. خواہ وہ صرف زوجین سے متعلق ہوں یا پورے انسانی معاشرے سے وابستہ ہوں!۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

(الروم ۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں. تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ ۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں۔ اور تم ان کے لئے۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (البقرہ ۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔

چوتھے نمبر پر اسلام نے دونوں صنفوں کے تمام احوال واطوار اور ان کے مشترکہ اور انفرادی امور کو منظم کر دیا ہے۔

## باہمی تعلقات کیلئے رہنما اصول

اسلام کی تنظیم انسانی فطرت اور معاشرے میں اس کے کردار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

۱۔ اسلام نے ملکیت، کسب اور میراث میں دونوں کے حقوق بیان کئے۔ اور بعض فروعات میں دونوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات بھی بیان کر دیں تاکہ ان تمام نظریات کا خاتمہ ہو جائے جو عورت کو اس کے حق سے محروم کرتے ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء ۳۲)

جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (النساء ۔ ۷)

مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے۔ جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ۔ (النساء ۔ ۱۱)

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ۔ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ۔ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء-۱۱)

اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیئے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو۔ اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی۔

وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ۔ (النساء-۱۲)

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں۔ مگر اس کا بھائی یا ایک بہن موجود ہو۔ تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًا مَّرِیۡٓـئًا۔ (النساء-۴)

اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

۲۔ اسلام نے خاندانی نظام کو بیان کیا۔ اور خاندان میں زوجین کے باہمی عمل ان کے حقوق اور بچوں کے حقوق بیان کئے۔

ازدواجی تعلق کی ابتداء مہر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے بیان کیا۔

وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ فَمَا

ان کے ماسوا اجنبی عورتیں۔ انہیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو

اِسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔

(النساء ۲۴)

نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔ البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اللہ علیم اور دانا ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ عورت میراث نہیں بن سکتی۔ نہ اسے شوہر کی وفات کے بعد حق نکاح سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اس طرح شوہر کے خاندان والوں کی طرف سے فدیہ دے۔ اور نہ اسے تکلیف پہنچانے کی غرض سے طلاق کے بعد روکا جا سکتا ہے۔ کہ وہ شوہر کی طرف سے اپنے نفس کا فدیہ دے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ

اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے۔ کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو۔ مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھدی ہو۔ اور اگر

زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِيْنًا۔

(النساء ۱۹-۲۰)

تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنیکا ارادہ ہی کر لو۔ تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو۔ اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کرکے واپس لوگے۔

اسلام نے مرد کو گھر کا قوام بنایا ہے۔ اسی پر انفاق لازم کیا ہے۔ اسے قوام ہونے کے لحاظ سے پورے حقوق استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ تاکہ وہ خاندان کو جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچا سکے اور اس آشیانہ کی حفاظت کرسکے جس سے بچے متعلق ہیں۔ دراصل اجتماعی نمو اور ارتقاء کے دور میں انسانی معاشرے کے تمام حقوق خاندانی تاسیسات پر اعتماد کرتے ہیں۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَاللَّاتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔

(النساء ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس بناء پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ۔ خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو۔ اور مارو۔ پھر اگر وہ تمہارے مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے۔ جو بڑا اور بالاتر ہے۔

اگر خاندانی نظام زوال اور تفکک سے دوچار ہو تو پھر یہ حکم ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ (النساء۔۳۵)

اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔ وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے۔ تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور باخبر ہے۔

اگر یہ کوشش صلح کامیاب نہ ہو تو پھر طلاق ہے۔ تاکہ ہر ایک فریق اپنا ساتھی تلاش کر کے پھر سے مضبوط بنیادوں پر خاندان کی تشکیل کرے۔

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔۱۳۰)

لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے علیحدہ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ اور وہ دانا اور بینا ہے۔

مسئلہ طلاق میں بھی اسلام نے شرائط تعداد، رجوع اور نفقہ کی صورت تمام امور بالتفصیل بیان کر دیئے ہیں۔

پھر والدین کے افتراق کی صورت میں بچوں کے حقوق بھی بیان کئے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیئے، تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں،

الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔

(البقرہ-۲۳۳)

اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچہ کے باپ پر ہے۔ ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو۔ وہ معروف طریقے پر ادا کر دو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

☆ ☆ ☆

عورت اور جنسی تعلق کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر میں اس سے زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ میں نے "اسلامی معاشرہ" نامی کتاب میں اس موضوع پر ایک مکمل باب تحریر کیا ہے۔

غرض اسلام میں یہ مسئلہ تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ پوری طرح واضح ہے

اور مکمل طور پر انسانی فطرت اور زوجین کے مزاج کے مطابق ہے۔ اسلام نے زوجین کو جو مخصوص مراعات دی ہیں ان میں بھی فطرت کی باریکیوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے اور انسان بہت کم جانتا ہے۔ کیونکہ انسان کے بارے میں ہماری جہالت محیط ہے۔!

ایک امر کی جانب مختصر طور پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ اسلام کا تصوّرِ انسان اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ صنفی تعلق ایک حیوانی تعلق بن کر رہ جائے۔ کیونکہ انسان اپنی تخلیق، اپنے مقصدِ وجود، اور اپنے انجام میں منفرد ہے۔ اس کی اس خصوصیت کا تقاضا ہے کہ اس کے صنفی تعلقات بھی بامقصد اور حیوانی ملاپ اور وحشیانہ لذت سے بلند و بالا ہوں۔ اس کے صنفی تعلق میں اس کے مقصدِ وجود اور اس کی طبعی ساخت سے ہم آہنگ کوئی مقصدِ وجود ہو ــــ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ [1]

یہاں صنفی مسئلہ میں اسلام کا نقطہ نظر زیادہ تفصیل سے بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا موضوع وہ بے راہ روی ہے جس سے انسانیت مختلف ادوار میں دوچار رہی ہے۔ کیونکہ انسانیت اللہ کی راہ سے بھٹک گئی۔ اور انسانیت نے اپنے لئے جہالت، ہوائے نفس، ضعف، اور شہوت پر مبنی نظام تراش لئے اور کبھی بھی انسانیت معتدل اور پر اطمینان و سکون وضع میں نہیں رہی۔

رومی دور چونکہ جدید مغربی زندگی کی بنیاد ہے۔ اس لئے ہم اس موقعہ پر رومی دور سے مغربی معاشرے کی بے راہ روی بیان کریں گے ــــ جیسا کہ ہم تصورِ انسان، اس کی فطرت اور صلاحیتوں کے بارے میں کر چکے ہیں۔

## عورت کا مقام - یونانی اور رومی تہذیب میں

مغرب میں عورت کے بارے میں نقطہ نظر ہمیشہ بدلتا رہتا ہے

کبھی اسے زندوں کے بجائے گری پڑی بے جان شے اور گناہ اور برائی کی دعوت دینے والی

[1] اس موضوع کو بالتفصیل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پردہ اور محمد قطب کی اسلام اور مادیت میں مطالعہ کیجئے۔

شیطان مردود قرار دیا گیا ہے کبھی اسے معاشرے کا سردار اور معاشرتی اقتدار پر حکمران تسلیم کیا گیا۔ اور کبھی اسے مجبور کیا گیا کہ وہ زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرے۔ مشقت اٹھائے اور کام کرے اور حمل رضاعت و تربیت کے دُکھ بھی جھیلے۔

اسی طرح صنفی تعلق دو انتہاؤں کے درمیان حرکت رہا۔ ایک مرتبہ صرف اسے حیوانی تعلق سمجھا گیا۔ پھر شیطانی گندگی اور نجاست خیال کیا گیا۔ اور پھر دوبارہ حیوانی تعلق خیال کر لیا گیا۔

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر مغرب کے جاہلی نظام ہائے حیات میں کبھی اس مسئلہ میں ایسا کوئی معتدل رویہ اختیار نہیں کیا گیا جو انسان کی فطرت کریمہ کے مناسب ہو (ان کے یہاں عورت کے بارے میں یہ تصور کبھی بھی نہیں ابھرا۔ کہ عورت نفس انسانی کا ایک حصہ جنس بشری کی خالق، بچوں کے کاشانۂ زندگی کی محافظ اور انسان کے عناصر وجود کی امانت دار ہے اور کسی نظام اور عمل کی بہتری کی بجائے اسے انسان کی فلاح و بہبود کے فرائض انجام دینا ہیں۔!)

اسی طرح صنفی تعلق میں قدیم جاہلیتوں سے لے کر جاہلیت جدیدہ تک کبھی بھی معتدل رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔

ان کے یہاں یہ نقطۂ نظر کبھی پیدا نہیں ہوا کہ صنفی تعلقات انسانیت کی خدمت کا ایک وسیلہ ہیں۔ ان تعلقات سے تخلیق انسان کے لئے پاکیزہ، شعوری، مخصوص اور محفوظ پرورش گاہ مہیا ہو سکتی ہے۔ جبکہ تخلیق انسان۔ انتہائی قیمتی شے ہے۔ لذت کی بجائے ادائے فرض اس تعلق کی بنیاد بننا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کا مستقبل اور قیام تمدن اسی سے وابستہ ہے۔

یہی حال قدیم یونانی جاہلیت میں تھا۔ مگر یہاں ہم خوف طوالت سے اس کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں۔

یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا، وہ اہل روم تھے۔ یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر آپ دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ جب وحشت کی تاریکی سے نکل کر تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نظام معاشرت کا

نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں پر پورے حقوق مالکانہ حاصل ہیں بلکہ بعض حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے۔

جب وحشت کم ہوئی اور تہذیب و تمدن میں رومیوں کا قدم آگے بڑھا تو اگرچہ قدیم خاندانی نظام بدستور قائم رہا، مگر عملاً اس کی سختیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ اور ایک حد تک اعتدالی حالت پیدا ہوتی چلی گئی۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہلِ روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا۔ اور رفتہ رفتہ نکاح و طلاق کے قوانین اور خاندانی نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر رونما ہوا کہ صورتِ حال سابق حالات کے بالکل برعکس ہو گئی۔ نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (*Civil contract*) بن کر رہ گیا۔ جس کا قیام و بقا فریقین کی رضامندی پر منحصر تھا۔ ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو بہت ہلکا سمجھا جانے لگا۔ عورت کو وراثت اور ملکیت مال کے پورے حقوق دیدیئے گئے اور قانون نے اسے باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کر دیا۔ رومی عورتیں معاشی حیثیت سے نہ صرف خود مختار ہو گئیں۔ بلکہ قومی دولت کا ایک بڑا حصہ بتدریج ان کے حیطۂ اختیار میں چلا گیا۔ وہ اپنے شوہروں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتی تھیں۔ اور مالدار عورتوں کے شوہر عملاً ان کے غلام بن کر رہ جاتے تھے۔ طلاق کی آسانیاں اس قدر بڑھیں کہ بات بات پر ازدواج کا رشتہ توڑا جانے لگا۔ مشہور رومی فلسفی و مدبر سینکا (سنہ ۴ ق م ۔ سنہ ۶۵ع) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرتِ طلاق پر ماتم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب رُوم میں طلاق کوئی بڑے شرم کے قابل چیز نہیں رہی۔ عورتیں اپنی عمر کا حساب شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں۔" اس دور میں عورت یکے بعد دیگرے کئی کئی شادیاں کرتی جاتی تھی۔ مارشل (سنہ ۴۳ع ۔ سنہ ۱۰۴ع) ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو دس خاوند کر چکی تھی۔ جوڈنل (سنہ ۶۰ع ۔ سنہ ۱۳۰ع) ایک عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے پانچ سال میں آٹھ شوہر بدلے سینٹ جیروم (سنہ ۳۴۰ع ۔ سنہ ۴۲۰ع) ان سب سے زیادہ ایک باکمال عورت کا حال لکھتا ہے۔ جس نے آخری بار تیئیسواں شوہر کیا تھا۔ اور اپنے شوہر کی بھی وہ اکیسویں بیوی تھی۔

Marfat.com

اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب سمجھنے کا خیال بھی دلوں سے نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی زنا کو ایک معمولی چیز سمجھنے لگے۔ کاٹو (CATO) جس کو ۱۸۴ ق م میں روم کا محتسب اخلاق مقرر کیا گیا تھا۔ صریح طور پر جوانی کی آوارگی کو حق بجانب ٹھیراتا ہے۔ سسرو (CISRO) جیسا شخص نوجوانوں کے لئے اخلاق کے بند ڈھیلے کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپکٹیٹس (EPICTETUS) جو فلاسفہ رواقیین (STOICS) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصول رکھنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت کی صحبت سے اجتناب کرو مگر جو اس معاملہ میں ضبط نہ رکھ سکیں انھیں ملامت بھی نہ کرو۔" ؎

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومی معاشرے کے بندھن ڈھیلے ہو گئے۔ اور وہ تباہی سے دوچار ہو گیا۔ اور بالآخر رومی سلطنت کا سقوط ہو گیا۔

## عورت کے بارے میں انتہا پسندانہ نقطہ نظر

یا تو مندرجہ بالا اباحیت مطلقہ اور بے قید شہوانیت اور صرف حصول لذت کے لئے بے مقصد صنفی ملاپ تھا ۔۔ یا کلیسا یورپ کو دوسری انتہا تک لے گیا۔ اب اس کی جگہ رہبانیت اور عورت سے فرار نے لی۔ اور عورت کو ذلیل اور کمتر تصور کر لیا گیا۔

ہم پہلے ہی مغربی معاشرے میں رہبانیت اور کلیسائی اقتدار اور اس سے رونما ہونے والے اضطراب اور بے راہ روی کو بیان کر چکے ہیں جس سے چھٹکارا پا کر یورپ جاہلیت جدیدہ کی وادیوں میں بھٹک کر رہ گیا۔

اب ہم کلیسائی تصور کے زیر سایہ پھیلنے والے اس نظریہ کو بیان کرتے ہیں جو عورت اور صنفی تعلق کے بارے میں اس وقت یورپ نے اپنایا ہوا تھا۔

"ان کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے مرد

---

؎ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ پردہ ص ۱۸۔ ۲۱ اسلامک پبلی کیشنز۔ لاہور

کے لئے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ تمام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوا ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی اس کا شرمناک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اس کو اپنے حسن اور جمال پر شرمانا چاہیئے کیونکہ وہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو دائما کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ وہ دنیا اور دنیا والوں پر لعنت اور مصیبت لائی ہے۔

ترتولیان (TERTULLIAN) جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجر ممنوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"

کرائی سوسٹم (chrysostum) جو مسیحیت کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے۔ عورت کے حق میں کہتا ہے:

"ایک ناگزیر برائی۔ ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت۔"

ان کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابل اعتراض چیز ہے۔ خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اخلاق کا یہ راہبانہ تصور پہلے سے اخلاقی فلسفہ (NEO - PLATONISM) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ مسیحیت نے آکر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرد اور دوشیزگی معیار اخلاق قرار پائی اور تاہل کی زندگی اخلاقی اعتبار سے پست اور ذلیل سمجھی جانے لگی۔ لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقوٰی، تقدس اور بلندی اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔ پاک مذہبی زندگی بسر کرنے کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ یا تو آدمی نکاح ہی نہ کرے اور اگر نکاح کر لیا ہو تو میاں اور بیوی ایک دوسرے سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھیں۔ متعدد مذہبی مجلسوں میں یہ قوانین مقرر کئے گئے کہ چرچ کے عہدیدار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں۔ میاں اور بیوی کی ملاقات کھلی جگہ میں ہو اور کم از کم دو غیر آدمی موجود ہوں۔ ازدواجی تعلق کے

نجس ہونے کا تخیل طرح طرح سے مسیحیوں کے دل میں بٹھایا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا کہ جس روز چرچ کا کوئی تہوار ہو۔ اس سے پہلے کی رات جس میاں بیوی نے یکجا گزاری ہو۔ وہ تہوار میں شریک نہیں ہو سکتے۔ گویا انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس سے آلودہ ہونے کے بعد وہ کسی مقدس مذہبی کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہے۔ اس راہبانہ تصور نے تمام خاندانی علائق حتیٰ کہ ماں اور بیٹے تک کے تعلق میں تلخی پیدا کر دی۔ اور وہ رشتہ گندگی اور گناہ بن کر رہ گیا جو نکاح کا نتیجہ ہو۔

ان دونوں نظریات نے نہ صرف اخلاق اور معاشرت میں عورت کی حیثیت حد سے زیادہ گرا دی۔ بلکہ تمدنی قوانین کو بھی اس درجہ متاثر کیا کہ ایک طرف ازدواجی زندگی مردوں اور عورتوں کے لئے مصیبت بن کر رہ گئی۔ اور دوسری طرف سوسائٹی میں عورت کا مرتبہ ہر حیثیت سے پست ہو گیا۔" ؎

## جدید مغربی تصور۔ اباحیت مطلقہ

پھر یورپ نے کلیسا اور کلیسا کے عقائد سے گردن چھڑا لی۔ لوگ اللہ سے اور مذہب سے بیزار ہو گئے اور ہر اس شے سے بیزار ہو گئے جس کا کوئی صحیح یا غلط تعلق اللہ سے یا مذہب سے ہو۔

انیسویں صدی میں ڈارون فرائڈ اور مارکس نے اپنی تمام تر توجہات اس امر پر مرکوز کر دیں کہ انسان کی تحقیر کی جائے۔ چنانچہ ڈارون نے انسان کو حیوانِ مطلق بتایا۔ فرائڈ نے اسے جنس کی گندگیوں میں دھکیلا۔ اور کارل مارکس نے انسان کو مادہ اور اقتصادی عوامل کے سامنے سرنگوں کر دیا۔

ان توجیہات نے نہ صرف تصورِ انسان پر اثر ڈالا۔ بلکہ عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں صحیح تعلقات کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔ اخلاق کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ اور مرد و زن کو شہوت رانی اور لذت پرستی کے لئے آزاد چھوڑ دیا حتیٰ کہ اس لذت پرستی میں تحفظ نوع کا حیوانی مقصد بھی مدنظر رکھا۔ بلکہ یورپ اور امریکہ کے لوگ اسے آزادانہ اختلاط کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے لگے

---

؎ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ پردہ (ص ۲۲-۲۴) اسلامک پبلی کیشنز لاہور

اور اس سے رونما ہونے والی ذمہ داریاں عورت اور مرد دونوں کے لئے بوجھ بن کر رہ گئیں جنسی ملاپ کے نتائج سے ضبط تولید، اسقاط حمل اور قتلِ اولاد کے ذریعے نجات حاصل کرنا صنفین کا اصل مقصد بن گیا۔ (اس موضوع پر ہم آئندہ باب میں بالتفصیل گفتگو کریں گے۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب یورپ کلیسا اور کلیسائی تصورات سے چھٹکارا پا چکا۔ اللہ اور اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات سے آزاد ہو گیا۔ اور صنفی تعلقات میں جنسی لذت انسانی مقاصد اور حیوانی مقاصد سے علیحدہ ہو گئی۔ تو نظریۂ عورت میں کیا تغیرات واقع ہوئے۔

امریکا کی اجتماعی زندگی کے بارے میں گفتگو کے دوران مجھ سے "ادارۂ معلمین" دگریلی کولوراڈو) کی ایک خاتون نے کہا۔

"صنفی تعلقات کا مسئلہ صرف حیاتی مسئلہ ہے۔ مگر تم مشرقی لوگ اخلاق کو گھسا کر اس آسان سے مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیتے ہو۔ چونکہ جانور اپنے جنسی ملاپ میں اخلاق کو مدنظر نہیں رکھتے اس لئے ان کی زندگی آسان سادہ اور آرام دہ ہے۔"

واشنگٹن کے "ولین ادارۂ معلمین" میں غیر ملکیوں کو انگلش سکھانے والے شعبہ کی ایک خاتون استاد نے لاطینی امریکہ کے طلباء کو امریکی روایات کے بارے میں ایک لیکچر دیا جس کے اختتام پر گسٹے مالا کے ایک طالب علم نے کہا "میں نے دیکھا ہے کہ چودہ۱۴ سال کی لڑکیاں اور پندرہ سال کے لڑکے مکمل جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ یہ چیز بڑی قبل از وقت ہے۔" اس پر خاتون استاد نے انتہائی پرجوش ہو کر جواب دیا۔ "ہماری زندگیاں انتہائی مختصر ہیں۔ اور ہم چودہ۱۴ سال سے زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" [۱]

سینکڑوں مثالوں میں سے میں نے دو مثالیں اس لئے منتخب کی ہیں کہ یہ اساتذہ سے متعلق ہیں۔ اور ایک استاذ بہ نسبت کسی دوسرے شخص کے زیادہ دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اس اباحیت کی بناء پر اب طبعی اور جائز طریقوں سے جنسی بھوک نہیں مٹتی۔ اس لئے لڑکے

---

[۱] "میرا چشم دید امریکا" سید قطب

اور لڑکیوں میں صنف مقابل کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے جنسی شدوزبڑھتا جارہا ہے. عورتوں اور مردوں کے جنسی رویہ کے بارے میں کنزی کی رپورٹ بڑے دقیق اور عجیب اعداد و شمار کی حامل ہے۔

میں واشنگٹن کے ہوٹلوں کے بارے میں اپنا ذاتی مشاہدہ پیش کرتا ہوں ۔ جس حد تک ادب و حیا۔ مجھے اجازت دیں۔

ولایات متحدہ امریکہ پہنچنے کے دو دن بعد میں اپنے مصری ساتھی کے ساتھ ایک ہوٹل میں جا کر ٹھہرا۔ ہوٹل کا ایک سیاہ فام ملازم ہم سے مانوس ہوگیا. کیونکہ ہم رنگ دار بھی تھے اور ہمارا برتاؤ بھی اس کے لئے تحقیر آمیز نہ تھا۔ چنانچہ اس نے "مختلف دلچسپیوں" اور سحر خانہ لطف اندوزیوں کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور بتانے لگا بعض کمروں میں اکثر نوجوان جوڑے ہوتے ہیں جو مجھ سے کوکا کولا منگاتے ہیں۔ اور جب میں لے کر جاتا ہوں تو وہ جس حالت میں ہوتے ہیں اسی میں رہتے ہیں اور کوئی تبدیلی نہیں ہوتی!

ہم نے تعجب سے پوچھا: "کیا وہ شرماتے نہیں ہیں؟"

تو اس نے جواب بڑے تعجب سے دیا: "کیوں؟ وہ اپنی خواہشات کو تسکین پہنچا رہے ہیں۔ اور لطف اندوز ہو رہے ہیں!"

بہرکیف بہت سے مشاہدات کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوا. کہ امریکی معاشرہ اس امر کو برا نہیں سمجھتا کہ جس طرح انسان چاہے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور اگر جبر نہیں ہے تو جرم بھی نہیں ہے خواہ قانون کی کتابوں میں اسے جرم ہی گردانا گیا ہو"

یورپ اور شمالی یورپ کی حالت امریکہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

معاشرتی زندگی، انسان کی تباہی، انسانی معاشرے کی تباہی اور انسانی تہذیب کے زوال پر اس انحلال کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ہم آئندہ باب میں بیان کریں گے۔

☆ ☆ ☆

## اخلاقی زوال میں کلیسا کا کردار

جدید معاشرے کے انحلال میں کلیسا اور اہلِ مذہب کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جو لوگ زیادہ عرصہ یورپ یا امریکہ میں نہیں رہے یا جو گہری نظر نہیں رکھتے۔ وہ امریکہ میں کلیسا کی کثرت سے دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات ایک دس ہزار کی آبادی کے گاؤں میں بیس کلیسا نظر آتے ہیں۔ بڑی کثرت سے مذہبی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور مذہبی تہوار منائے جاتے ہیں۔ بہت سی پارٹیوں کے نام مسیحی ہوتے ہیں۔ اور اہلِ مذہب بہت بڑی تعداد میں کتابیں اور مقالے لکھتے رہتے ہیں۔ اور خالص اجتماعی، سیاسی، معاشی اور علمی زندگی میں پر مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے لوگ یہ خیال کرتے لگتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں مذہب کا گہرا اثر ہے اور اہلِ مذہب اجتماعی زندگی میں بڑی حد تک اثر انداز ہیں ـــ یہ ایک سطحی سا خیال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب سے لوگوں نے کلیسا کو چھوڑ دیا، اجتماعی زندگی کلیسا سے کٹ گئی۔ اور جب دورِ احیاء، عصرِ روشن اور موضوعی مادی فلسفہ نے لوگوں کو کلیسا سے متنفر بنا دیا۔ اس وقت سے کلیسا معاشرے اور لوگوں کے پیچھے کھنچا چلا آ رہا ہے۔ اب کلیسا کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ معاشرے اور لوگوں کو مذہب کی طرف مائل کرے۔ بلکہ اب مقصد یہ ہے کہ وہ کسی طرح عوام کی خوشنودی حاصل کرے۔

اب کلیساؤں میں عبادت کے بعد مخلوط مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ جن میں شراب پی جاتی ہے رقص ہوتا ہے۔ تفریحِ طبع کے لئے کھیل ہوتے ہیں۔ اور نشہ میں مست نوجوان جوڑے صبح تک بوس و کنار میں مصروف رہتے ہیں ـــ یہ سب کام کلیسا اس لئے کرتے ہیں تاکہ نوجوان کلیسا میں آ سکیں۔

چونکہ کلیسا لوگوں کے فطری جذبات کے بالمقابل موقف اختیار کر کے یہ تجربہ کر چکا ہے کہ عوام نے کس طرح کلیسائی نظام سے بغاوت کی اور اسے ترک کر دیا۔ اب کلیسا لوگوں کی خواہشات و میلانات

کی مخالفت سے بچنا ہے کہ کہیں دوبارہ عوام کلیسائی نظام کو کچل ڈالیں اور اسے ترک کر دیں۔!

یوروپ نے دوبارہ قدیم روما کی زندگی اختیار کرلی۔ قدیم روما میں کاہن خداوندان دیوتاؤں کی شان میں ترانے گاتے، اور ان کے نام پر تفریحی میلے لگتے، مگر خداوندان روما کا عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اور نہ انھیں یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ لذت و لطف پر کوئی قدغن لگائیں۔

لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یوروپ کی زندگی میں کلیسا کا کوئی دخل ہے۔ یا وہاں پر مذہب کا کوئی قابلِ احترام وجود ہے۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ کلیسا کی لچک اور اس کی ثقافت کی بنا پر اسے معاشرے میں نفوذ کا موقع ملا ہے۔ اور دورِ احیاء عصرِ روشن اور مادیت کے بعد بھی مسیحیت کو اپنا وجود برقرار رکھنے کی ضمانت مل گئی۔ حقیقت میں یہ خیال ایک وہم ہے۔ واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیوپولڈ فائس ایک روشن ذہن مغربی ہے جس نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام محمد اسد رکھا۔ یہ شخص اپنی کتاب "اسلام دوراہے پر" میں تحریر کرتا ہے۔

"جدید مغرب کے ہر پہلو پر مادی منفعت اور توسیع پسندی کا تصور غالب ہے۔ اہلِ مغرب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زندگی کے خزانے دریافت کیے جائیں اور انھیں کام میں لایا جائے مگر وہ زندگی میں کسی اخلاقی قدر کے اضافے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ زندگی کے معنی اور اس کے مقاصد ایک مغربی کی نظر میں عرصۂ دراز سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" (ص۔ ۳۰)

"مذہب ہمیشہ یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ ایک ایسا ہمہ گیر اور مکمل ضابطۂ اخلاق موجود ہے جس کے تقاضے پورے کرنے پر انسان مجبور ہیں۔ مگر جدید مغربی تمدن، معاشی، اجتماعی اور قومی تقاضوں کے سوا کسی تقاضے کو تسلیم نہیں کرتا۔ آج کی مغربی زندگی کا معبود روحانی نہیں ہے بلکہ "رفاہیت" ہے۔ اور آج کا فلسفہ، فلسفہ طاقت و قوت ہے۔ اور یہ دونوں باتیں قدیم رومی تمدن کی میراث ہیں۔" (ص۔ ۳۳)

## مغربی تہذیب پر رومی فکر کے اثرات

رومی سلطنت کی بنیادی فکر یہ تھی کہ قوت کا استعمال کیا جائے اور مادر وطن کے مفاد اور طبقہ بالا کے عیش و عشرت کے لئے دیگر اقوام کا استحصال کیا جائے۔ حالانکہ خود رومی اس طبقہ بالا کے ظلم و ستم کے شکار تھے۔ اور روم کا مشہور زمانہ انصاف صرف رومیوں کے لئے ہی مخصوص تھا۔ اس قسم کا رُخ صرف مادی تہذیب اور مادی زندگی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ اس مادیت کا بنا و ستوار فکری ذوق سے ہوتا ہے مگر اس میں روحانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

رومیوں کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے روایتی دیوتا صرف یونانی دیومالا کا ایک عکس تھے جس کو انھوں نے سماجی دستور کے طور پر باقی رکھا ہوا تھا مگر عملی زندگی میں اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ کاہن اپنے الوہیاتی نغموں میں امور زندگی کے بارے میں کچھ باتیں بتا دیتے۔ مگر دیوتاؤں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ انسان کے لئے کوئی اخلاقی قانون مقرر کریں۔

انہی عناصر سے جدید مغربی تمدن نشو و نما پاتا ہے۔ اگرچہ دوران ارتقاء کئی دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوئے ہیں اور مغربی تمدن نے مغربی ثقافت کے کئی پہلوؤں میں تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے کئی پہلوؤں میں تبدیلیاں آج وہی ہے جو رومی دور میں تھا۔ جس طرح قدیم روم کی اجتماعی اور فکری فضا خالص مفاد پرست اور لادینی تھی اسی طرح جدید مغرب بھی مفاد پرست اور لادینی ہے، خواہ آج کے مغرب کے پاس مذہب کے باطل ہونے پر کوئی دلیل ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ دلیل کی ضرورت بھی محسوس نہ کرے۔ مغربی فکر بہر حال اخلاق کو عملی دنیا سے خارج متصور کرتی ہے چاہے وہ تھوڑی دیر کے لئے مذہب سے چشم پوشی کرلے، اور اسے ایک سماجی دستور ہی کیوں نہ بنائے۔

مغربی تمدن بالکلیہ اللہ کے وجود کا منکر نہیں ہے۔ مگر موجودہ فکری نظام میں اللہ کے لئے کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

مغربی تمدن میں انسان کے فکری عجز اور اس بات کو کہ وہ زندگی کے احاطہ سے عاجز ہے۔ ایک خوبی متصور کرلیا گیا ہے۔ آج کا ایک مغربی شخص ساری عملی اہمیت صرف ان افکار کو دیتا ہے۔

جو تجربی علوم کے دائرے میں آتے ہیں۔ یا ان افکار کو اہمیت دیتا ہے جو انسان کے اجتماعی تعلقات پر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوتے ہوں، چونکہ اللہ کا مسئلہ ان دونوں قسم کے افکار کے ذیل میں نہیں آتا۔ اس لئے مغربی عقل اللہ کو عملی اعتبارات سے ساقط کر دیتی ہے۔"
(ص ۔ ۳۶ ۔ ۳۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی، اس حقیقت کو اپنی بلند پایہ کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں تحریر فرماتے ہیں۔

## امریکی معاشرہ کا ذاتی فائدہ

ان دو مصنفین کے اقتباسات کے بعد میں اپنی کتاب "میرا چشم دید امریکا" سے کلیسا، معاشرہ، عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں چند جملے نقل کرتا ہوں جس سے فریب خوردہ سیاحوں کا وہم کسی حد تک دور ہو جائے گا۔

امریکی، کلیسا بہت تعمیر کرتے ہیں۔ ایک دس ہزار کی آبادی کے شہر میں میں نے کلیسا شمار کی تو بیس تھے۔ امریکی اتوار کی رات اور دن کو بہت کثیر تعداد میں کلیسا جاتے ہیں، اور مقامی سینٹ اور اولیاء کی یادگار محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

مگر اس کے باوجود امریکی مذہبی روح اس کے احترام اور تقدس سے بہت دور اور امریکہ کا شعور و عمل مذہب سے قطعاً خالی ہے۔

اگر عیسائی دنیا میں کلیسا عبادت کی جگہ ہے تو امریکہ میں عبادت کے سوا ہر شے کی جگہ ہے۔ آپ کو امریکی کلیسا اور کسی کھیل کود میں امتیاز کرنا سخت مشکل ہے۔ وہاں اکثر لوگ کلیسا فقط ایک اجتماعی ضرورت سمجھ کر جاتے ہیں تاکہ وہاں احباب سے ملاقات ہو سکے اور اچھا وقت گزر سکے یہ تصور عوام تک محدود نہیں۔ بلکہ کلیسا کے راہنماؤں کا بھی یہی تصور ہوتا ہے۔

ہر کلیسا میں ایک مخلوط مجلس ہوتی ہے اور کلیسا کے راہنماؤں کی یہ کوشش ہوتی ہے، کہ اس میں بڑی تعداد شامل ہو۔ مختلف مذاہب اور فرقوں کے حامل کلیساؤں میں زبردست مقابلہ

ہوتا ہے۔ ہر کلیسا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے لٹریچر شائع کرتا ہے۔ دروازے اور دیواریں رنگین بلبوں سے سجائی جاتی ہیں۔ لذیذ اور شوق دلانے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں جس طرح تاجر اور سینما والے کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اگر شہر کی خوبصورت اور گانے اور رقص کی ماہر لڑکیوں کو بلا لیا جائے۔ جیسے سینما کے دروازوں میں لڑکیاں بھڑکیلے لباس پہنے کھڑی رہتی ہیں۔

ذیل میں کلیسا کی ایک محفل کا اعلان ہے جو کسی کالج کے ہال کی دیوار پر لگا ہوا تھا تاکہ کالج کے طلبہ اور طالبات اس چھوٹے سے شہر کے کلیسا میں پہنچ سکیں۔

اتوار ——— یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء ——— شام چھ بجے

ہلکا پھلکا ڈنر ——— جادو کی کھیل ——— پر اسرار شعبدے

دوڑ ——— دلچسپیاں ——— رقص

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کلیسا کا نگراں جانتا ہے کہ اس کا کام تھیٹر کے ڈائرکٹر اور تاجر سے مختلف نہیں ہے۔ کامیابی حاصل ہونی چاہیئے خواہ کسی طرح سے حاصل ہو۔ کیونکہ اس کامیابی کے طفیل اسے عزت و دولت ملتی ہے جس قدر لوگ کلیسا سے ملحق ہوں گے اس کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اور اسی طرح شہر میں اس کا احترام اور اثر و رسوخ بڑھے گا۔ کیونکہ امریکی حجم اور تعداد کو دیکھتے ہیں یہی ان کے شعور کا پیمانہ ہے۔ میں ایک رات ریاست کولوراڈو کے شہر گریلی کے ایک کلیسا میں گیا۔ کیونکہ میں اس کلیسا کے کلب کا ممبر تھا۔ بلکہ میں واشنگٹن سے لے کر کیلی فورنیا تک تمام گرجوں کے کلبوں کا ممبر رہا۔ کیونکہ یہ وہاں کی معاشرتی زندگی کا ایک بڑا اہم پہلو ہے جس کو قریب سے اور گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور میرا مدعا بھی امریکی معاشرہ کا مطالعہ تھا۔

جب کلیسا میں سروس ختم ہوگئی۔ تلاوت ہوئی اور کچھ لوگوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد ہم نماز کے کمرے سے ملحق رقص کے کمرے میں چلے گئے۔ پادری صاحب اپنی میز پر بیٹھ گئے۔ اور نوجوان لڑکوں نے لڑکیوں کے ہاتھ پکڑ لئے ۔ یہ نوجوان کچھ دیر پہلے تلاوت میں مصروف تھے۔

رقص گاہ میں رنگا رنگ بلب روشن تھے۔

گراموفون کے گانوں کی دھنوں میں رقص میں تیزی آتی گئی۔ اب ساری رقص گاہ میں ناچنے والوں کے پیر اور پنڈلیاں نظر آرہی تھیں، بازو کمر میں حمائل تھے۔ اور سینے اور ہونٹ مل چکے تھے۔ غرض ساری فضا رومانوی ہوگئی ..... اس کے بعد پادری صاحب اپنی نشست گاہ سے نکل کر آئے ہر جگہ متفحصانہ نظریں ڈالیں اور بیٹھے ہوئے حاضرین و حضرات کو اکسایا کہ وہ بھی رقص میں شریک ہوں۔ پھر جیسے پادری صاحب کو یہ محسوس ہوا کہ سفید بتیاں کچھ زیادہ روشن ہیں اور اس طرح رومان پرور فضا میں خلل آرہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے خاص امریکی پھرتی اور نزاکت کے ساتھ بتیاں گل کرنی شروع کردیں۔ وہ اس لئے کہ کہیں رقص میں خلل نہ پڑ جائے۔ یا کوئی جوڑا دوسرے لوگوں سے نہ ٹکرا جائے۔ اب رقص گاہ پوری طرح رومان پرور ہوگئی۔ اور پادری صاحب گراموفون کی طرف لپکے تاکہ اس ماحول کے مطابق کوئی ایسا ریکارڈ لگائیں کہ بیٹھے ہوئے لوگ بھی رقص میں شریک ہوجائیں۔ چنانچہ انھوں نے مشہور امریکی گانے کا ریکارڈ لگا دیا۔ جس کا نام ہے:

(But, baby it is cold out side)

(مگر میری پیاری باہر سردی ہو رہی ہے)

یہ گانا ایک لڑکے اور لڑکی کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ لڑکے نے لڑکی کو اپنے گھر میں روکا ہوا ہے۔ لڑکی کہتی ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے تاکہ وہ گھر چلی جائے کیونکہ رات زیادہ ہوچکی ہے اور اس کی ماں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ لڑکی کی ہر بات کے جواب میں لڑکا یہی کہتا ہے (مگر میری پیاری باہر سردی ہو رہی ہے)۔

پادری صاحب تھوڑی دیر انتظار کرکے اور اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو ہیجان انگیز گانوں اور موسیقی کی رو میں بہتے دیکھ کر خوشی خوشی اپنے گھر چلے گئے۔ تاکہ نوجوان جوڑے اس شب بیداری سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اور جو جوڑا سب سے آخر میں کلیسا سے جاتے وہ

پادری صاحب کو کلیسا کی چابی دیتا جائے۔ کیونکہ کلیسا سے روانگی ہر جوڑے کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔!

ہمارے ایک عراقی دوست طالب علم کی ایک پادری صاحب سے بڑی دوستی تھی۔ اس عراقی کی ایک ساتھی ماری تھی۔ ایک دفعہ پادری صاحب نے اس عراقی سے پوچھا ماری کلیسا کیوں نہیں آتی۔ اور کہنے لگے کہ اگر تمام لڑکیاں غیر حاضر ہو جائیں اور صرف ماری آجایا کرے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ عراقی نے پوچھا۔ آخر آپ ماری کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں۔ تو پادری صاحب نے فرمایا۔ اس میں بڑی کشش ہے اور اکثر نوجوان اسی کے پیچھے آتے ہیں!

ایک شیطان عراقی طالب علم جو امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔ اور ہم اسے اس حرکات کی بنا پر ابوالعتاھیہ کہا کرتے تھے۔ خبر نہیں یہ شاعر قدیم اسے یہ نام دینے سے خوش ہوتا ہے یا ناراض —— اس عراقی طالب علم نے مجھے بتایا کہ اس کی دوست اس کی بغل میں سے نکل کر کلیسا دوڑ پڑتی تھی۔ تاکہ وہاں تلاوت کر سکے۔ اگر اسے ذرا تاخیر ہو جاتی تو پادری ابوالعتاھیہ کی حرکتوں کی طرف اشارہ کرتا کہ جس کی بنا پر اسے نماز میں آنے سے تاخیر ہوئی۔ مگر اگر ابوالعتاھیہ اس کے ساتھ ہی ہوتا تو پادری صاحب کچھ نہ کہتے۔

پادری کہتے ہیں کہ ہم انہی وسائل سے نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کلیسا کی اس کشش کا فائدہ کیا ہے جبکہ لوگ اس گندگی میں وقت گزارتے ہیں۔ کیا کلیسا جانا بذات خود کوئی مقصد ہے، یا وہاں جا کر شعور و عمل کو مہذب بنانا مقصود ہے۔ جہاں تک پادریوں کا سوال ہے۔ ان کی نظر میں کلیسا آنا ہی بذات خود مقصد ہے۔ اور امریکی لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں۔!

مگر جب ہم مصر آتے ہیں تو لوگ امریکی کلیسا کی خوب خوب تعریفیں کرتے ہیں کہ امریکی کلیسا خطا اور لغزشوں سے درگزر کرتا ہے۔ قلب و روح کی تطہیر میں لگا رہتا ہے، اور جدید ترین طریقوں سے مذہب کی برتری قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ لوگ کلیسا سے نہیں بھاگتے!" اللہ کی مخلوق کبھی

عجیب ہے!

٭ ٭ ٭

اوپر بیان کردہ تفصیل سے یورپ کی تاریخ میں عورت اور صنفی تعلق کے بارے میں پائے جانے والے نظریات کا تحفظ اور اضطراب پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ یورپ کی انتہاپسندی نے کبھی بھی اعتدال اختیار نہیں کیا کہ نفس واحد کے دونوں حصوں کو صحیح مقام دیا جاتا۔ عورت کے حقیقی کردار اور اس کے فطری مقام کا اندازہ کیا جاتا۔ جس کی بنا پر دونوں صنفیں اور تمام انسانیت پر بدبختی چھا گئی اور اس وقت تک چھائی رہے گی۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو جائے اور انسانی تہذیب کی زمام کار خداشناس ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔

# "اجتماعی اور معاشی نظام"

جس طرح یورپ میں انسان اس کی فطرت اور صلاحیتوں کے بارے میں تصور اور عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں نقطۂ نظر شدید قسم کی انتہا پسندی اور بے اعتدالی کے شکار رہے ہیں اسی طرح یورپ کے اجتماعی اور معاشی نظام بھی اسی انتہا پسندی اور بے اعتدالی سے دوچار رہے۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ جو نظام انسان کے لئے غلط تصور اور حقیقت انسان سے ناواقفیت کی بنیادوں پر قائم ہوگا اس میں یہ تمام خرابیاں ضرور ہوں گی۔ جب تک خود انسان کے بارے میں اس کی فطرت، اس کی صلاحیت، اس کے مقصد وجود اور اس دائرہ اثر کے بارے میں نقطۂ نظر درست نہ ہو اس وقت تک اس کے تمام روابط یقیناً بے راہ روی اور انتہا پسندی سے دوچار رہیں گے۔ اور بالخصوص اجتماعی اور معاشی روابط کیونکہ یہ براہ راست نظریۂ انسان سے متاثر ہوتے ہیں۔

گزشتہ باب میں ہم یہی بات ثابت کر چکے ہیں۔ اور یہیں سے تاریخ کی انسانی تعبیر ——— جو انسانی تصور سے ہم آہنگ ہے ——— اور تاریخ کی مادی اور اقتصادی تعبیر جس پر مارکیت کی بنیاد ہے ——— کی راہیں علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہیں۔

## تاریخ کی مادی تعبیر

اب اگر مارکسی یہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار معاشرے کے روابط پیدا کرتے ہیں اور یہ روابط انسان، اخلاق، مذہب، اصول

واقدار اور عادات و روایات کے بارے میں کوئی نقطہ نظر متعین کرتے ہیں۔ اور حکومت نظام غرض تمام انسانی روابط کی تشکیل کرتے ہیں۔

اور اگر مارکسی یہ کہتے ہیں کہ معاشی عوامل ہی انسانی زندگی اور انسانی معاشرے کو متحرک کرتے ہیں اور ہر تغیر و تبدیلی میں معاشی عوامل ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور انسان کو ان کی جبریت کے سامنے تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

اگر مارکسی ایسا کہتے ہیں۔ تو یہ ان کا فریب ہے۔ کیونکہ مارکسیت فطری محرکات اور انسانی محرکات کے حقائق تلے پامال ہو چکی ہے۔ اور لینن، اسٹالن، اور خروشچیف اصل نظریہ میں ترمیمات کے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جس چیز کو یہ "ترمیم" کہہ رہے ہیں وہ ترمیم نہیں۔ بلکہ سراسر اصول اشتراکیت سے انحراف ہے۔ صرف نام اور علامت اشتراکیت کی رہ جاتی ہے۔ پھر یہ لوگ اس انحراف کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مارکسیت ایک ارتقاء پذیر مذہب ہے۔ حالانکہ دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی نظریہ اس قدر جبریتوں سے بھرپور نہیں جس قدر مارکس اور اینگلز کی اوّلین مارکسیت بھری ہوتی ہے۔

مارکسیت میں ارتقاء کا دعویٰ ایک بالکل نئی شے ہے اور اس کا مدعا یہ ہے کہ اس طرح فطرت اور حقائق کا مقابلہ کیا جا سکے، اور روس اور چین اور تمام اشتراکی ممالک میں خوفناک جاسوسی نظام کے باوجود جو لوگ آزادی کے لئے جہاد کر رہے ہیں انھیں کچلا جا سکے۔

اس موقع پر مارکسیت پر تنقید کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ جو معاشی اور اجتماعی نظام انسان کے میلانات صلاحیتوں اور اس کی حقیقی ضرورتوں سے ناواقفیت کے علم الزعم قائم کئے جاتے ہیں ان میں کس قدر بے راہ روی اور انتہا پسندی رونما ہو جاتی ہے کیونکہ یہ نظام اللہ کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے روگرداں ہو کر قائم کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقت انسان کو اور اس نظام کو جاننے والا ہے جو اس کے لئے بہتر ہے۔

یورپ میں معاشرے کی حالتیں اسی طرح تغیر پذیر ہوتی رہیں اور انتہا پسندی سے دوچار ہوتی رہیں۔ جس طرح انسان اور اس کی فطرتوں اور صلاحیتوں کے بارے میں تصوّر اور عورت

اور صنفی تعلقات کے بارے میں نظریہ ۔ بلکہ معاشرہ اس سے بھی زیادہ انتہا، پسندی اور مصائب سے دوچار رہا ہے۔ اور معاشرے میں معاش اور اقتدار ایک شدید کش مکش کا سبب بنے رہے کبھی کبھی تو یہ کش مکش شدید تر ہو کر وحشت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور جب بھی کبھی کسی انتہا پسندانہ غلطی کی اصلاح کی کوشش کی گئی، اس کی جگہ ایک نئی اور غلط انتہا پسندی نے لے لی اور کبھی اعتدال پیدا نہ ہو سکا۔ کیونکہ انسان اپنے نفس اپنی قدرت اور اپنی حقیقی ضرورتوں سے غافل رہا۔ اپنی شہوات اور خواہشات پر چلتا رہا۔ اور اللہ سے اور اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات سے روگرداں رہا۔

مارکسیت اور مادی تعبیرات جب ان انقلابات و تغیرات کو بیان کرتی ہیں تو انسان کو قطعاً خارج از بحث کر دیتی ہیں۔ مارکسیت تو صرف اقتصاد ہی کو الٰہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ الٰہ اقتصاد انسان کے ارادے فطرت صلاحیتوں اور طاقتوں سے بے نیاز انسانی اقدار میں رد و بدل کرتا رہتا ہے۔ اور انسانی اقدار ہمیشہ عوامل اقتصاد کے سامنے سرنگوں رہتی ہیں۔ بلکہ اقدار پیدا ہی اقتصادی عوامل سے ہوتی ہیں۔

مارکسیت ان تغیرات کو ذرائع پیداوار کے تغیر کی طرف منسوب کرتی ہے۔ مارکسیت کے نقطۂ نظر سے ذرائع پیداوار جبری طور پر معاشرے کے روابط میں تغیر پیدا کرتے ہیں جس کی بناء پر اس وقت موجود معاشرے کی حالت اور اس حالت میں جو ذرائع پیداوار اجتماعی اور معاشی روابط میں تغیر کے بعد چاہتے ہیں۔ تضاد رونما ہو جاتا ہے۔ اس تضاد کے نتیجے میں انقلاب آتا ہے تاکہ ایسی حالت پیدا ہو سکے جو تغیر شدہ ذرائع پیداوار کے مناسب ہو۔ اس سارے تغیر و تبدل میں انسان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اگر انسان ذرائع پیداوار کو اپنی فکر اور اپنے ہاتھ سے بدل دے ۔ تو اس سلسلے میں مارکس صاحب خاموش ہیں۔

مارکسیت میں ذرائع پیداوار ایک اور الٰہ ہے۔ مگر یہ الٰہ اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہے اور الٰہ کے تغیر پذیر ہونے سے معاشرے کی حالت جبری طور پر بدل جاتی ہے۔

## فلسفۂ اشتراکیت کا تنقیدی جائزہ

ہم اس موقع پر مارکسیت پر تنقید نہیں کر رہے بلکہ یہ بتا رہے ہیں کہ اللہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی زندگی میں کس قدر بے اعتدالی ہے۔ البتہ ہم "جبریت" اور ان اسباب پر ضرور تنقید کریں گے۔ جن پر مارکسی فلسفہ قائم ہے۔

مارکسی تمام تغیرات اور معاشرے کی جملہ حالتوں کو ذرائع پیداوار اور اجتماعی حالتوں کے تغیر کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ اور ان تغیرات کو تاریخ کی جبریت بتاتے ہیں۔ اور کارل مارکس کے بقول اس کی دلیل تاریخی واقعات ہیں۔

فرد واحد۔ یا چند افراد کے پاس اس دعوے میں کہ وہ تمام تاریخی واقعات کا علم رکھتے ہیں، تاریخ کے جملہ پوشیدہ اور ظاہر عوامل سے بھی باخبر ہیں اور تمام زمانوں میں انسان کے محرکات سے بھی واقف ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی کے متخصص سائنسدان انسان کے بارے میں اپنی جہالت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ جس قدر خرافات اور لغو اس سب ہے اس کے لحاظ سے اسے کسی مفروضے تک کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ چہ جائیکہ اس پر مکمل مذہب کی بنیاد رکھدی جائے۔ مگر مارکسیت اس کے سوا کوئی اور رائے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس نے ان لاکھوں آدمیوں کا بے دریغ خون بہادیا جو انسان کی تاریخ کے بارے میں مارکسی نقطۂ نظر سے مختلف کوئی رائے رکھتے تھے یعنی مارکسیت نے بھی وہی کچھ کیا، جو پہلے کلیسائے مغرب کر چکا تھا۔ یعنی یہ کہ اس نے اپنی مقدس خرافات سے اختلاف رکھنے والے سائنس دانوں کو زندہ آگ میں جلا ڈالا تھا۔ حالانکہ کلیسا کی خرافات بھی مارکسیت کی سائنٹفک خرافات سے مختلف نہ تھیں۔

مارکسیت کا سائنٹفک مذہب تاریخ کے تمام عوامل اور انسان کے تمام محرکات کے علمی مطالعہ کی مشقت میں نہیں پڑتا۔ بلکہ زندگی کے ایک عنصر معاش ہی کو الٰہ بنالیتا ہے جس کی مشیت کو کوئی رد کرنے والا اور جس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔ اور انسان اس کی جبریت کے سامنے مجبور ہے۔

پھر مارکسیت اپنے الٰہ کی قدرت کا اندازہ تاریخ عالم کے بجائے صرف تاریخ یورپ سے لگاتی ہے۔ اور اس کی جبریت کو پوری روئے زمین پر نافذ کردیتی ہے۔ یہ بھی سائنٹفک مذہب کی خرافات میں شامل ہے۔

مارکسیوں کا خیال ہے کہ یورپ کی تاریخ بعینہٖ دنیا کی تاریخ ہے اور جو خداوند اقتصاد یورپ پر حکمراں رہا ہے۔ وہی ساری دنیا پر حکمراں ہے۔ مارکسی تاریخ عالم کی حالتوں کی جبریت کو تاریخ یورپ میں پیش آنے والے واقعات کے لئے دلیل بناتے ہیں، اور تاریخ بشر کے تمام عوامل کو صرف اس لئے رد کردیتے ہیں کہ خداوند اقتصاد کی وحدانیت کا اثبات کرسکیں!

مارکسیوں کے دل میں یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ تاریخ صحیح ہے اور یہ تاریخ عالم ہے۔ پھر بھی معاشرتی حالات اس وجہ سے غلو اور انتہا پسندی کا شکار رہے ہیں اُن میں کبھی اعتدال پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ کہ حالات تضاد اور کش مکش سے دوچار رہے۔ اس لئے کہ یہ حالتیں انسان کے خودساختہ ضابطۂ حیات کی بناء پر وجود میں آئیں۔ کیونکہ انسان اپنے نفس اور اپنی حقیقی ضرورتوں سے ناواقف ہے۔ اس کے احکام، تصرفات اور اختیارات جہالت بشری ضعف، ہوائے نفس اور شہوات سے بوجھل ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان نے شہوات، ہوائے نفس ضعف اور جہل پر قابو پانے کے لئے اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات کو بھی اختیار نہیں کیا۔ کہ اس سے کم از کم انسان اس بات پر ضرور قادر ہوجاتا کہ اس کے ہیجانات بغیر ہدایت ادھر اُدھر نہ بھٹکتے!

یہ کوئی بات ان کے دل میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ یہ ان کے اقتصادی فلسفہ کی مادیت ہے جس میں خدائے کائنات کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو اللہ پر یقین رکھنے والوں کا سخت مذاق اڑاتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں کلیسا نہ تھا جو اللہ کے نام پر ہمیں ہنکاتا۔ اور ہم کلیسا اور کلیسا کے خدا دونوں سے بیزار ہوکر اس طرح بھاگتے جیسے گدھے شیر کو دیکھ کر بھاگ رہے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے محفوظ رکھا کہ ہم انسانی علم ـــ یا انسانی جہل ـــ کو انسانی زندگی کے بنیادی اصول وضع کرنے کا کام سپرد کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود ایسا روشن اور واضح نظام دیا ہے جو انسان کی فطرت، اس کی صلاحیتوں، اس کی قوتوں اور اس کی حقیقی ضرورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

## اسلامی نظام کے لئے کیا کیا جائے

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم اس مسئلہ پر کسی دوسرے نقطۂ نظر سے غور کرتے اور مسائل کو نرمی کے ساتھ طے کرنے کے قابل ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم صحیح علمی نقطۂ نظر اختیار کرکے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کریں۔ یہ نہ ہو کہ اس میں سے کچھ حصّہ اچک کر کلیسا، اور کلیسا کے مذہب اور خدا سے بیگانہ ہو جائیں۔

اس طرح ہمیں بے راہ روی اور انتہا پسندی کے تمام مظاہر اور اس کے پیچھے پنہاں حقیقی اسباب کا پتہ لگ جائے گا۔ ہمارے نظریات مستقل ہو جائیں گے۔ اور ہمارا ضابطۂ زندگی ہمارے مستقل مطالعہ پر قائم اور اللہ کی مدد اور اس کے مقرر کردہ طریقہ زندگی سے ماخوذ ہوگا۔ اسی وقت ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ ہمارے ضابطۂ زندگی میں اور گرد وپیش میں پھیلے ہوئے ضابطہ ہائے حیات میں بنیادی اور اصولی فرق ہے۔ ہماری اور تمام معروف مذاہب کی راہیں جدا ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر اور دوسرے لوگوں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ زندگی اور تاریخ کی ہماری تعبیر اور دوسری تعبیریں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ غرض ہر اس عنوان میں فرق نظر آئے گا جس کو دور جدید کے اجتماعی نظاموں نے اپنایا ہو۔ اور جس پر ہمارے اسلامی نظام نے روشنی ڈالی ہو۔

اس مختصر سی تصنیف میں اس مطالعہ کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ اس کے لئے ایک مستقل تنظیم، مناسب سہولتیں اور ضروری وقت درکار ہے۔ پھر اس کے لئے اللہ کا راستہ اختیار کرنے کے مناسب حالات بھی ضروری ہیں۔ اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ

ضابطۂ حیات کو عملاً زندگیوں میں نافذ کرنا ہے اور اس مطالعہ کا مقصد ہی یہ ہو کہ اس کے نتائج کو عملی دنیا میں منطبق کیا جائے۔ صرف مطالعہ اور ثقافت مقصود نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی طریقۂ زندگی فکر و نظر دونوں ہی کے لحاظ سے ایک واقعی اور عملی طریقہ کار ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ صرف بحث و مطالعہ میں اپنی صلاحیتیں ضائع کی جائیں بلکہ اصل مقصد اس کو عملی زندگی میں برپا کرنا ہے اور واقعی دنیا میں جلوہ گر کرنا ہے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب پوری زندگی میں اسلامی نظام کے نافذ کرنے کا جذبہ موجود ہو۔

اس بحث میں مغربی زندگی کی بے راہ روی اور اس کے پوری دنیا میں پھیلاؤ اور توسیع کو واضح کرنا ہے کہ کس طرح مغربی زندگی کے مفہوم، تعبیریں، علامتیں، عنوانات اور اصطلاحات ساری دنیا پر چھا گئی ہیں۔ اور فکر و تعبیر کا ہر پہلو کس طرح مغربیت میں الجھ کر رہ گیا ہے!

## انسانی قوتوں میں رابطے کی کمی

رومی غلامی کا مشہور دور، جاگیر داری، سرمایہ داری مارکسیت اور نازیت ہر ایک، ایک انتہا ہے جس کا علاج دوسرے طبقہ پر ظلم کر کے کیا گیا ہے۔ ہر ایک میں ایک طبقہ پر ظلم ہے جس کا علاج دوسرے طبقے پر ظلم کر کے کیا گیا ہے۔ ہر ایک نظام میں انسان اور اس کی بنیادی خصوصیات پر زیادتی ہے جس کا علاج ایک دوسرے نظام سے کیا گیا۔ اور اس میں بھی انسان اور اس کی خصوصیات پر زیادتی اور اعتداء ہے — مگر تمام طبقات میں اعتدال اور توازن کبھی پیدا نہیں ہوا کبھی انسانی قوتوں میں ربط قائم نہیں ہوا۔ کبھی کسی فرد کو اس طرح اپنی انفرادیت بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ کہ جس میں تناسق اور اعتدال کے ساتھ تمام افراد کی مشترک خصوصیات سے ابھرنے والے جماعتی حق کی رعایت ہو سکے۔ یہ سب باتیں اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات ہی میں یکجا ہو سکتی ہیں۔

یہاں ہم رومی غلامی کا دور چھوڑ کر مختصراً جاگیر داری نظام کو پیش کرتے ہیں۔

## یوروپ کے جاگیردارانہ نظام کی بنیادی خصوصیات

سب سے پہلے ہمیں جاگیرداری کی ان بنیادی خصوصیات کو علیحدہ کر دینا چاہیئے جو اصطلاحی اور تاریخی لحاظ سے یوروپ میں ظہور پذیر ہوتیں۔ اور ان ثانوی اور سطحی مظاہر کو علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ جو مختلف ادوار میں دنیا کے دیگر حصوں میں پائے گئے۔ یہ امتیاز علمی اور شعوری حیثیت سے ضروری ہے۔

یوروپ کا جاگیرداری نظام صرف بڑی بڑی ملکیتوں کے وجود کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس نظام کی اپنی علیحدہ خصوصیات تھیں۔

اس نظام کی اہم ترین خصوصیتیں یہ تھیں۔

۱۔ کسان زمین کے ساتھ بندھے ہوتے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے آلات زراعت اور حیوان، وہ زمین، آلات، زراعت اور حیوانات کے ساتھ نئے مالک زمین کو منتقل ہو جاتے تھے۔ اگرچہ انھیں دور غلامی کی طرح فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر چونکہ وہ زمین سے بندھے ہوئے تھے اس لئے نہ وہ دوسری زمین میں جا سکتے تھے اور نہ آزادی سے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتے تھے۔

۲۔ جاگیردار اپنی جاگیرداری کا قانون ساز ادارہ ہوتا تھا۔ وہی کسانوں کے لئے قوانین بناتا اور ان کے لئے زمین اور آپس کے تعلقات کی تجدید کرتا۔

یہ ہے وہ جاگیرداری نظام جو یوروپ میں موجود تھا۔ اور مندرجہ بالا دو خصوصیات اس ملعون دور کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

یوروپ اس بدترین نظام کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا جس میں انسان کی کوئی قیمت نہ تھی انسان جانوروں اور سامان زراعت کی طرح نئے مالک کو منتقل ہو جاتا تھا۔ اسے زمین سے علیحدہ اپنے کسی مستقل وجود کا احساس تک نہ تھا۔ وہ زمین چھوڑ کر کسی دوسری جاگیرداری میں بھی نہ جا سکتا اگر وہ ایسا کرتا تو اسے قانوناً مفرور تصور کیا جاتا۔ اور اسے پکڑ کر دوبارہ سابقہ زمین میں بھیج دیا

جاتا۔ (جاگیرداری کے آخری دور میں یہ قانون اس حالت میں نافذ نہیں تھا جبکہ کوئی مالک مفرورین کو پناہ دیدے اور اس کا واپس نہ کرنا اس کی مصلحت کے مطابق ہو۔)

جاگیرداری نظام میں انسان کی عزت یوں بھی پامال تھی کہ وہ اپنے مالکوں کے ارادے کا غلام تھا۔ اس کے لئے جاگیردار کی زبان ہی قانون تھا اور انسان کے لئے اس سے ذلت و رسوائی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ دوسرا انسان اس کے لئے قانون بنائے۔ اگرچہ وہ قانون ساز اس کا دنیاوی آقا ہی کیوں نہ ہو"!!

## اسلامی معاشرہ

یوروپ اس ملعون نظام کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یہاں تک کہ صلیبی جماعتیں اسلامی معاشرہ میں آنا شروع ہوئیں اور اسلامی معاشرہ سے انھیں واسطہ پڑا۔ انھوں نے قریب سے مسلمانوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا تو انھیں اپنے ملعون نظام کے بجائے یہاں کوئی اور ہی نظام نظر آیا۔

انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے یہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ امیر و غریب۔ دولتمند و فقیر، مالک زمین اور کسان سب قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔ وہاں مالک زمین، امیر اور بادشاہ کی زبان قانون نہیں ہے۔ بلکہ ان کے پاس الٰہی قانون ہے جس کے مطابق عدالتیں فیصلے دیتی ہیں اور اگر امراء اور سلاطین کسی فرد یا جماعت پر کوئی زیادتی کریں تو انھیں بھی عدالت اسلامی میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اس دور میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے جنہوں نے بادشاہوں سے بھی ٹکر لی اور اس قسم کے جرأت مندانہ اقدامات کی گونج ساری اسلامی حکومت میں پھیل جایا کرتی تھی جس سے صلیبی لوگ بھی واقف ہوتے تھے ـــــ اس اسلامی معاشرے سے صلیبیوں کا دو صدیوں کا واسطہ رہا۔

باوجودیکہ اس وقت اسلامی معاشرے میں بہت کچھ الخرافات رونما ہو چکے تھے اور مسلمان بعض جزئیات میں اللہ کی شریعت کی رعایت سے بھی ہٹ گئے تھے ـــ مگر پھر بھی مسلم معاشرے میں اور صلیبیوں کے جاگیرداری معاشرے میں بہت بڑا فرق تھا۔

صلیبیوں نے دیکھا کہ مسلم معاشرے میں لوگ آزاد ہیں۔ یہ آزادی اس حد تک نہیں تھی کہ لوگ ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلے جائیں۔ بلکہ لوگوں کو اجازت تھی کہ اسلامی دنیا میں جہاں چاہیں۔ جائیں۔ کیونکہ پورا کا پورا وطن اسلامی تھا۔ اور امراء و سلاطین کی کثرت کے باوجود مسلمان افراد کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ یہاں لوگ آزاد ہیں کہ اپنے مزاج طبیعت کے لحاظ سے جو پیشہ چاہیں اپنائیں۔ ان کی اس آزادی میں کوئی قید نہیں ہے۔

انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مختلف پیشہ والوں کی انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک پیشہ کا ایک نگراں ہے۔ اور ایک پیشہ کے لوگوں میں تعاون اور مودت کے تعلقات قائم ہیں۔

ان میں سے کسی بات کا بھی یوروپ کی جاگیر داری میں کوئی وجود نہیں تھا۔

اسلامی معاشرے میں بھی بڑی بڑی ملکیتیں تھیں۔ مگر ان ملکیتوں نے یوروپ کی جاگیر داری جیسی شکل نہیں اختیار کی تھی۔ کیونکہ اسلامی معاشرے میں نہ آقا تھے اور نہ غلام، نہ زمین سے بندھے ہوئے غلام تھے اور نہ اعلیٰ طبقہ والوں کی مرضی کو قانون کی حیثیت دی جاتی تھی بلکہ سارے معاشرے میں اللہ کا نازل کردہ قانون نافذ تھا۔ غرض اسلامی معاشرے میں اس اصطلاحی فنی اور تاریخی جاگیر داری نظام کو کبھی جگہ نہیں ملی۔ جو یوروپ میں موجود تھا۔

## یوروپ میں اسلام کے اثر سے جاگیرداری کا خاتمہ

جن دو صدیوں میں صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکی رہی مسلم معاشرے کی حالت اور اس کی تاثیرات نے سیکڑوں صلیبیوں کو متاثر کیا۔ بلکہ ■ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو اسلامی دنیا دیکھنے والے عیسائیوں سے صرف یہاں کے حالات سنا کرتے تھے۔

یوروپ میں جاگیر داری نظام کے خاتمہ میں جس طرح کچھ داخلی عوامل کارفرما تھے، مثلاً نئے نئے پیشے ایجاد ہو رہے تھے، تجارتی شہر بن رہے تھے اور تاجروں کا ایک خاص طبقہ اُبھر

آیا تھا۔ اور چونکہ اس طبقے نے صلیبی جنگوں اور یورپ کی خانہ جنگیوں میں اپنے حاکموں کو مالی امداد دی تھی۔ اس لئے ان کو کچھ رعایتیں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ اسی طرح اسلامی دنیا سے آتے ہوئے اثرات بھی پوری مغربی دنیا پر چھا گئے تھے۔ اور یہ تمام باتیں مل کر جاگیرداری کے خاتمہ کا سبب بن گئیں۔ (حالانکہ یوروپ بالعموم اور مارکسی بالخصوص اسلامی دنیا کے اثرات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔)

جاگیرداری نظام بڑا ظالم اور ملعون نظام تھا جس میں انسان کی عزت نفس کو بری طرح پامال کیا گیا تھا۔ اس نظام میں اور دورِ غلامی میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ زمین کے غلام کو فروخت نہیں کیا جاتا ہے اور اسے جانوروں کی غذا نہیں بنایا جاتا تھا۔

اصل میں اسلامی دنیا سے آنے والے اثرات نے جاگیرداری نظام کو کھوکھلا کر دیا اور کچھ داخلی عوامل بھی سازگار ہو گئے اور بالآخر یہ نظام ختم ہوا۔

## سرمایہ دارانہ نظام اور فرد کی آزادی

جاگیرداری نظام میں انفرادی وجود، انفرادی حریت اور انسانی وجود کو بری طرح پامال کیا گیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر سرمایہ داری نظام میں فرد کو بالکلیہ بے لگام رہنے دیا گیا۔ انفرادی آزادی پر کوئی قدغن باقی نہ رہی اور فرد کا مفاد ہی اعلیٰ ترین مفاد قرار پایا۔

فرد کی آزادی کے جملہ پہلو معاشی میدان میں بھی ابھرے۔ کیونکہ ہر بات افراد کے نشاطات ان کی رغبتوں اور ان کے مفادات پر چھوڑ دی گئی۔ معاشرے یا اخلاق کا کوئی اعتبار نہ رہا۔ اور نہ کوئی ایسی بات باقی رہنے دی گئی جو فرد کی آزادی پر قدغن لگائے۔ یا فرد کے مفادات میں رکاوٹ بنے۔ اور مفاد بھی اس صورت میں جس صورت میں فرد چاہے!

جب اجتماع اور معاش میں فرد کو آزادی بخشی گئی تو مدعا یہ تھا کہ جاگیرداری سے عوام کی گردن چھڑا کر انھیں ایسے مواقع مہیا کئے جائیں کہ ان کی انفرادی صلاحیتیں اور دلچسپیاں ابھر کر انھیں ابداع، حرکت اور قوت عطا کر دیں۔ وہ زمین کے چھپے ہوئے خزانوں اور طبیعت کی پوشیدہ قوتوں کو انسانی مفاد کے لئے بروئے کار لائیں ـــ ان تمام امور نے سرمایہ داری

نظام کو جنم دیا۔ جو جاگیرداری نظام کو سامنے رکھتے ہوئے ترقی کی طرف ایک قدم تھا۔

ان تمام خدمات اور انسانیت کے لئے ان تمام بھلائیوں میں ایک انتہا پسندی کا عنصر بھی کارفرما تھا۔ ایک غلطی کا ردِعمل دوسری غلطی میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور ایک بیماری کا علاج دوسری بیماری سے کیا جا رہا تھا۔

## سرمایہ داری ۔ تنقید ہی جائز

فرد کی بے قید آزادی نے سرمایہ داری کو جنم دیا۔ جس نے ملعون سودی نظام سے ابتداء کی، رفتہ رفتہ سود سرمایہ داری میں اس طرح سرایت کر گیا کہ سود ہی جدید اقتصادیات کی بنیاد بن گیا۔ اور بالآخر اخلاقی، اجتماعی اور انسانی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ اب اقدار کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اقتصادی قوانین میں دخل دے سکیں اور اس مجنونانہ مسابقت کو روک سکیں جو محنت کشوں کی محنت کے نتیجہ میں سرمایہ کو اور سرمایہ دارانہ مصلحتوں کو عظیم تر کرتی چلی جا رہی ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک صورت حال یہ ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام میں کارکن، صنعت کار، تاجر اور کارخانے دار سب کے سب سرمایہ کو حرکت دینے والے ان افراد کے اجیر اور کارندے بن گئے ہیں جو بینک قائم کرتے ہیں۔ اور حصہ داروں اور جمع کرنے والوں کا سارا سرمایہ بینکوں میں کھینچ لیتے ہیں۔ تاکہ اس سرمایہ کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کر سکیں۔ کیونکہ جو سرمایہ وہ کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اس کی ساری آمدنی انہی کو ملتی ہے اور نہایت معمولی رقم حصہ داروں اور امانتیں دکھانے والوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ جبکہ مزدور، صنعت کار، تاجر، صارفین اور کارخانے دار سب کی محنتیں سودی منافع کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ جو بالآخر سرمایہ داروں کی اس مختصر سی ٹولی میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جو صنعتوں اور تجارتوں میں قرضے دیتے ہیں۔ اور سب کی محنتوں کے ثمرات پر قابض ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کی یہ ظاہری خرابی نہیں ہے۔ جس پر تنقید کی جائے۔ کہ قومیں اور حکومتیں سرمایہ داری کی مصلحتوں کی تابع ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ایک طبقہ ایسا موجود ہے کہ قومیں اور حکومتیں

اس کی تابع ہیں. یہ طبقہ معاشی نظریات، پروپیگنڈہ کے وسائل، اساتذۂ جامعات، قوانین، اور ضابطوں میں دبا ہوا ہے. اور ساری دنیا میں موجود ہے ـــ یہ سود خواروں کا طبقہ ہے جو قرض دینے والے بینک قائم کرتا ہے. اور ان کے تاسیسی بونڈز کا مالک ہوتا ہے. یہ طبقہ ان چھپے ہوئے دولت خانوں کا مالک ہے جہاں ساری انسانی جدوجہد کا حاصل پہنچ جاتا ہے ـــ اس جدوجہد میں کارخانے داروں اور تاجروں کی محنت بھی شامل ہوتی ہے جنہیں بورژدا کہا جاتا ہے ـ

سرمایہ داری نظام کی ساری برائیاں سود کی پیدا کردہ ہیں. سود ہی کی بناء پر تمام انسانی محنتوں کا حاصل، دولت خانوں کے مالکین، بینکوں کے موسسین اور تاسیسی بونڈز رکھنے والوں کی ایک معمولی سی جماعت کو مل جاتا ہے.

## سرمایہ داری اور اخلاقی تنزل

سرمایہ داری نظام کی ایک خاصیت اخلاقی زوال بھی ہے. اولاً تو اخلاقی زوال فرد کی بے قید آزادی، انسان کی حیوانیت، کائنات کی مادیت اور تاریخ کی مادّی اور معاشی تعبیر جیسے مختلف نظریات کے زیر اثر رونما ہوا. اور یہ سب نظریات کلیسا سے فرار اور ہر مذہبی فکر سے روگردانی کے نتیجے میں پیدا ہوئے.

مگر ان نظریات کے علاوہ اخلاقی زوال کا ایک پوشیدہ محرک موجود ہے ـــ اور وہ ہے سودی نظام.

جو شخص کاروبار کے لئے سودی قرضے لیتا ہے. اس کی فکر یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع بخش کاروبار کرے تاکہ سودی منافع بھی ادا کئے جا سکیں اور اسے اپنا منافع بھی بچ رہے چنانچہ وہ کاروبار میں جنسی ہیجان پیدا کر کے اس کی تسکین کے سامان مہیا کئے جائیں. اور جو عیش کوشی کے جذبات پیدا کر کے انہیں پورا کرے. مذہبی اور اخلاقی میلانات سے عاری دنیا میں یہ کاروبار سب سے زیادہ نفع بخش ہے ـ

سرمایہ کا رد و بدل کرنے والے، دولت خانوں کے مالکین، بینکوں کے نوسیس اور تاثیسی بونڈز کے حصہ دار۔ جو اکثر یہودی ہیں۔ اور وہ کاروباری لوگ جو سودی قرضے لیتے ہیں۔

ان سب دولت مندوں کی سیاست یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں اخلاقی زوال، عیش، فیشن پرستی اور نت نئے تکلفات کو رواج دیا جائے۔ تاکہ جنسی عیاشی کے مختلف ساز و سامان، آسائشات اور لذتیں رواج پاسکیں اور ان پر کوئی مذہبی یا اخلاقی قید باقی نہ رہے۔

عریاں فلمیں، ہیجان انگیز رقص گاہیں، بے حیائی سے پر صحافت، غلاموں کی تجارت، شراب اور نشہ آور ادویہ۔ سامان عیش و زینت، معاشرے کی عریانی، کلب اور انجمنیں۔ غرض بے حیائی اور عیاشی کے وہ تمام مظاہر جن پر موجودہ دور کی سیکڑوں صنعتیں قائم ہیں۔ سب کی سب سرمایہ داری کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔

ان تمام صنعتوں کی تائید اور حمایت کے لئے سرمایہ داری مختلف فلسفوں اور نظریات کا سہارا لیتی ہے۔ اور اساتذہ، ادباء، فنکاروں، قانون دانوں اور حکومتی نظاموں کو ان کی تائید و توثیق پر لگا دیتی ہے۔

اس نظام میں سرمایہ کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہات جس طرف چاہے مبذول کر دے۔ کیونکہ لادینی معاشروں میں اصل اقتدار سرمایہ کے پاس ہوتا ہے اور ان میں زندگی اور سرمایہ اللہ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات کے تابع نہیں ہوتے۔

سرمایہ معاشرے کو غلط رخ پر اسی وقت چلا سکتا ہے جبکہ معاشرے میں اللہ کا قانون نافذ ہونے کے بجائے سرمایہ حکمراں ہو۔ مگر جب اللہ کا قانون نافذ ہوتا ہے تو وہ معاشرے کو بھی اور سرمایہ کو بھی پاکیزہ اور خیر سے بھرپور راستے پر لگا دیتا ہے۔ اور یہ گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا کہ دولت فساد اور سرکشی کا سبب بن جائے۔

● دولت کسی معاشرے میں فساد پیدا نہیں کیا کرتی۔ بلکہ فساد کا سبب تو وہ نظام، مذہب منہاج اور تصور ہوتا ہے۔ جو کسی معاشرے پر حکمراں ہو۔

مندرجہ بالا جائزہ سرمایہ داری نظام کی خرابیوں کا ایک سرسری سا جائزہ ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک انتہا کا دوسری انتہا سے اور ایک بیماری کا دوسری بیماری سے تدارک ہے انتہائی قید کا انتہائی بے قیدی اور آزادی سے علاج کیا گیا ہے۔ جیسے شدت سے لگام کھینچے رہنے سے گھوڑا بدک گیا ہو۔!

ہم سودی سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ تمام اقتصادی مشکلات کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکتے۔ اور نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس نظام کے زیر اثر کس قسم کے مصائب اور بدحالی کے دور آتے ہیں۔ جن میں بے کاری اور کساد بازاری عام ہو جاتی ہے۔

نہ ہم ان مصائب کا تفصیلی تذکرہ کر سکتے ہیں جو سرمایہ داری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سامراج کی وجہ سے رونما ہوئی ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دار کو ایسی مارکیٹیں چاہئیں۔ جو اس کی عظیم صنعتوں کے لئے خام مال مہیا کر سکیں اور تیار شدہ مال کو کھپا سکیں۔

ہم اس موقعہ پر نئے سامراج کا بھی تفصیلی ذکر نہیں کر سکتے۔ نیا سامراج اب پہلے کی طرح کسی ملک پر فوجی قبضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ سرمایہ دار ملکوں کو اپنا فاضل سرمایہ لگانے کے لئے مارکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ صنعتوں کے پھیلاؤ کی بناء پر اپنے ملک میں اس سرمایہ کو کسی کاروبار میں لگانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لئے سرمایہ دار ایسے پس ماندہ ممالک پر نظر رکھتے ہیں۔ جو دوسروں کے سرمایہ سے "صنعتی" بننا چاہتے ہوں۔ تاکہ انھیں اس فاضل سرمایہ سے سود بھی ملتا رہا۔ اور یہ سرمایہ ان کے اپنے ملک میں بے کار نہ پڑا رہے ـــ یہی سامراج ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے افریقہ پر چھپاتا جا رہا ہے۔

ہم سرمایہ داری نظام کی ان تمام خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ بلکہ صرف مختصر اشارات کافی ہیں ـ کیونکہ اصل موضوع یہ بتانا ہے کہ اللہ اور اللہ کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے کھٹک کر انسانیت اپنے معاشی اور اجتماعی نظاموں میں بے راہ روی سے دوچار رہی ہے۔

## قومی ملکیت ریاستی سرمایہ داری ہے

اس کے بعد اجتماعی نظام میں عظیم مصیبت نازل ہوتی ہے جو مختلف ناموں اور مختلف شکلوں سے مشرق و مغرب پر چھا جاتی ہے۔ اور جو انفرادی سرمایہ دارانہ نظام کے انتہائی ردِعمل کے طور پر ابھر کر آئی ہے۔

یہ ایک نئی انتہا ہے جو قدیم انتہاء کی ردِعمل ہے۔ یہ ایک نئی بیماری ہے جس سے انسانیت کی قدیم بیماری کا علاج ہو رہا ہے۔ یہ ایک پہلو انسانی خصوصیات کو بچا کر دوسرے پہلو سے انسانی خصوصیات کو تباہ کرتا ہے۔

یہ تمام افکار اس امر پر متفق ہیں کہ پیدائش دولت کے تمام وسیلوں اور ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں دیدیا جائے ۔ جیسا کہ نازی کہتے ہیں ۔ یا قوم کے ایک طبقہ کی ملکیت بنا دیا جائے جیسا کہ مارکسی کہتے ہیں ۔ ایک ایسی کہانی جس کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیسے وجود میں آئے گی۔

کاربوہنٹ۔ اپنے مقالے" اشتراکیت نظری اور عملی لحاظ سے" میں کہتا ہے:

" کلاسیکی نقطۂ نظر کے مطابق اشتراکیت ایک ایسے غیر طبقاتی معاشرے کی دعویدار ہے جس میں پیدائش، تقسیم اور تبادل کے تمام ذرائع عوام کی ملکیت ہوں گے۔ اور جبر و زبردستی کی علامت ۔ حکومت ختم ہو جائے گی ۔ مگر اس اشتراکی معاشرے کے قیام اور سرمایہ داری کو ختم کر دینے والے انقلاب میں ایک دور ایسا ہو گا جس میں محنت کشوں کی آمریت ہو گی ۔ روس بزعم خود اس مرحلہ سے گزر رہا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ روس اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتا ہے۔ کیمونسٹ نہیں کہتا ۔ اور جو ریاستیں سوویٹ اتحاد تشکیل کرتی ہیں۔ انھیں عوامی سوویٹ سوشلسٹ یونین کہا جاتا ہے کیمونسٹ یونین نہیں کہتے۔ کیونکہ اشتراکیت مستقبل میں آنے والا اعلیٰ ترین مرحلہ ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اشتراکی معاشرہ اس اصول کا تابع ہوتا ہے کہ" ہر انسان سے حسب طاقت

لیا جائے اور حسب ضرورت دیا جائے" مگر جس چیز کو ابتداً مارکس نے پیش کیا اور جس بات کو اسٹالن بار بار دہراتا رہا اس قسم کی مساوات قائم ہونا اشتراکی معاشرے میں محال ہے۔ اس لئے اب اشتراکی معاشرے میں یہ اصول کارفرما ہونا چاہیئے کہ "ہر شخص سے اس کی قدرت کے مطابق لیا جائے۔ اور اس کی محنت کے مطابق دیا جائے"

لینن اور اسٹالن بھی مارکس کے نقش قدم پر چلے۔ اور سرمایہ داری کے کھنڈرات پر تعمیر ہونے والے نئے نظام کو سوشلزم کا نام دیا۔ اسی وجہ سے ۳ دسمبر ۱۹۳۶ء کو منظور ہونے والے روسی دستور میں اشتراکیت کی جانب کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ سوائے مادہ نمبر ۱۲۶ کے جس میں تحدید کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا نام آیا ہے۔ نیز روس اپنے آپ کو مزدوروں اور کسانوں کی سوشلسٹ حکومت کہتا ہے۔ اسٹالن نے ۵ دسمبر کو اپنی تقریر میں کہا کہ جو شئے اب تک حاصل ہوئی ہے وہ سوشلزم ہے۔ نیز اسٹالن نے دستور میں شامل اس عبارت میں ترمیم کرنے سے انکار کر دیا کہ "سوویت تحریک کا انتہائی مقصد ایک خالص اشتراکی معاشرے کی تعمیر ہے" اور اس نے کہا کہ اس عبارت کا اس دستور سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو صرف حاصل شدہ منافع کو استعمال میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔

بہت سے اشتراکی اس امر سے انکار کریں گے کہ اسٹالن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ روس کے معاشی اور سیاسی نظام کو کوئی معنی پہنائے۔ مگر جن مقاصد کے حصول کے لئے اشتراکی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سوشلزم اور کمیونزم دونوں تغیر و تبدیلی کے قابل ہیں۔ جو بھی شخص آکسفورڈ ڈکشنری دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ دونوں (سوشلزم ۔ کمیونزم) کا مقصد ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا ہے۔ مگر ابھی تک کوئی شخص یہ معلوم نہیں کر سکا کہ آخر عوام کو ان وسائل پر کیونکر بالادستی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ان وسائل کی نگرانی عوام کے نام پر حکومت یا اس مقصد کے لئے متعین کی ہوئی تنظیم کرے گی۔ اس لئے عوامی ملکیت درحقیقت حکومت کی سرمایہ داری ہے۔ روس کی اشتراکیت اس امر کی انتہائی مناسب مثال ہے۔

اشتراکیت کی فکری بنیادوں پر بحث کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اشتراکیت کے بعینہٖ وہی مقاصد ہیں جو سوشلزم کے ہیں۔ دونوں میں جو کچھ بھی فرق ہے وہ وسیلہ اور ذریعہ کا ہے۔ مقصد کا نہیں۔ چنانچہ سوشلسٹ کہتے ہیں کہ ہم اشتراکی نظام جمہوری طریقوں سے لا سکتے ہیں مگر اشتراکی اس کو ناممکن سمجھتے ہیں۔

یورپ کے وہ تمام جماعتی نظام جو مختلف ناموں سے مشرق و مغرب پر چھائے ہوئے ان سب کی عظیم ترین برائی یہ ہے کہ وہ فرد کے وجود کو معطل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ انفرادیت انسان کے حیاتیاتی عقلی اور نفسیاتی وجود میں بڑی گہری جڑیں رکھتی ہے۔ اس انفرادیت کو ایک ایسے ڈھانچے میں رکھ کر جو جماعتی بھلائی کا ضامن ہو، اس سے پوری طرح کام لیا جائے۔ یہی نظام فطرت کے مناسب ہوگا۔ اگر اس انفرادیت کو کچلنے کی کوشش کی گئی تو یہ درحقیقت سارے انسانی ڈھانچے کو تباہ کرنے کے مترادف ہوگی۔

انفرادیت کا تقاضا یہ ہے کہ اقتصادی نظام اس قسم کا نہ ہو جو ہر شے کو حکومت کے ہاتھوں میں دیدے۔ اور سیاسی اور قانونی اقتدار کے ساتھ ساتھ ذرائع، آلات اور وسائل پیداوار بھی حکومت ہی کے قبضے میں چلے جائیں۔ کہ وہ ہی ایک تاجر ہو جو درآمد و برآمد کر سکے۔ اور لوگوں کو اشیاء فروخت کرے۔ وہی ایک سوچنے والا ذہن ہو اور کسی کو مخالف رائے کے اظہار اور ریاست کے اصول افکار اور وسائل پر تنقید کی قطعاً اجازت نہ ہو۔ اگر اس قسم کا نظام ہوگا تو انسان کی عام خصوصیات اور فرد کی خاص خصوصیات سب تباہ ہو کر رہ جائیں۔

انسانی فطرت کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی طبیعت اور انسانی وجود پر ظالمانہ و جابرانہ اقدامات کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتی۔ اور رفتہ رفتہ فطرت کے مقابلہ پر سارے ظلم بے اثر ہو جاتے ہیں۔
اشتراکی نظام (یا سوشلسٹ نظام) متواتر ترمیمات کر رہا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت یہ ترمیمات نہیں بلکہ مذہب کے بنیادی اصولوں سے تجاوزات ہیں۔ حقیقت میں حکومت کے سارے نظام اور دباؤ کے برخلاف فطرت کا دباؤ زیادہ شدید ہے۔

انتہا پسندی اور انسانیت کے قدم دائیں بائیں ڈگمگانے کی بنا پر جو ہولناک خون بہایا گیا جس میں لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔ اخلاق و آداب کی قربانی دینی پڑی اور انسانیت دلدل میں دھنستی چلی گئی ۔ ان امور کی طرف کئے گئے مندرجہ بالا مختصر اشارات کافی ہیں۔

انسان، اس کی فطرت و صلاحیت، عورت اور صنفی تعلقات اور اجتماعی اور معاشی نظام ۔ انسانی زندگی کے ان تین اہم پہلوؤں میں انسانیت کے نقطہ ہائے نظر بھی ہم نے مختصراً بیان کر دیئے ہیں۔

اللہ سے روگرداں اور اس کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے منحرف ہو کر یورپ ۔ اور اس کے ساتھ ساری انسانیت کو یہ مصائب جھیلنے پڑے ہیں۔

---

# "انسان دشمن تہذیب"

روئے زمین پر انسان کے ہاتھوں مادی ایجادات جہاں اس کی حیات اور ارتقاء کے لئے ضروری ہیں۔ وہاں یہ اس کا اساسی کردار بھی ہے۔اس سے اس کا وجود متحقق ہوتا ہے۔ اس کی ذات کو نمو حاصل ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے پیچیدہ اور منفرد وجود میں جو صلاحیتیں پنہاں کردی ہیں انھیں ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ہی اس فرض کو شعور اور ارادے سے پورا کرتا ہے۔ اور اسی سے اس کی تخلیق کا مقصد عظیم پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے ــــ انسان کی تخلیق کا مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کی خلافت کا قیام ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً — میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ (البقرہ)

قیام خلافت کے ساتھ ہی انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کے لئے اللہ کے نام پر عمل میں مصروف ہوجاتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (الذاریات) — میں نے جنوں اور انساں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے

مگر مادی ایجادات کی جس قدر شکلیں ہیں ــــ زمین میں کاشت کرنا، اس کے خزانوں کا پتہ لگانا اور اس کی قوتوں کو کام میں لانا، آسائش زندگی کے لئے قابل صرف اشیاء تیار کرنا، خلاپیمائی اور ستاروں تک پہنچنے کی کوشش کرنا ــــ ان تمام ایجادات کو اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق

انسان کی خدمت ہی کے لئے ہونا چاہیئے۔ خود اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین میں موجود تمام اشیاء کو انسان کے تابع بنا دیا ہے۔

## انسانی خصوصیت کی حفاظت

یہ بھی ضروری ہے کہ ان مادی ایجادات اور ان پر کھڑی ہونے والی تہذیبی عمارت میں انسانی خصوصیات کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔ نوع انسانی کی وہ خصوصیات جو اسے مادہ اور حیوان سے ممتاز کرتی ہیں۔ اور افراد کی وہ خصوصیات جو ہر فرد کی علیحدہ حیاتیاتی، نفسیاتی اور عقلی دنیا تشکیل کرتی ہیں۔

ان مادی ایجادات اور ان کے سہارے ابھرنے والی تہذیب میں کوئی ایسی شے ہرگز نہ ہونی چاہیئے جو انسانی خصوصیات کی ضد ہو۔ وہ ان خصوصیات کو تباہ کر دے یا ان کے نشوونما میں رکاوٹ بن جائے، اور ایسی بھی کوئی شے نہ ہونی چاہئے جو انسانی خصوصیات کی تحقیر کر کے انہیں کمتر ثابت کرے اور خود انسان کے کردار کو مادی ایجادات کے بالمقابل ثانوی درجہ دے دے۔

اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کہ انسان اس زمین میں سردار ہو۔ وہ اپنی نوعی اور شخصی خصوصیات کو نشوونما دے، اپنی ذات کا اثبات کرے اور مادی ایجادات کے ذریعہ ترقی کرتا جائے۔

ان دونوں امور میں نہ صرف یہ کہ تعارض نہیں ہے۔ بلکہ توافق اور ہم آہنگی ہے۔ مگر یہ جب ہی ہے۔ جب "تصور انسان" درست ہو، اس کے مرکز وجود ہونے اور زمین میں اس کے کردار کے بارے نقطہ نظر صحیح ہو اور جو خصوصیات اسے اپنے خالق کی جانب سے عطا ہوئی ہیں۔ اور جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے اس کا پورا پورا احساس ہو۔

مگر اس تہذیب ـــــ اگرچہ یہ تہذیب بھی گذشتہ تہذیبوں کی ایک کڑی ہے اور اپنی بنیادوں میں سابقہ تہذیبوں سے علیحدہ نہیں ہے ـــــ کے خالقوں کو انسان کی حقیقت اور اس کی خصوصیات کا کوئی علم نہیں ہے۔ اور نہ وہ اپنے دلوں میں انسانیت کی تکریم و احترام کا جذبہ رکھتے ہیں۔

تہذیب جدید کے خالقین علم و دانش سے محروم ہیں۔ کیونکہ اس تہذیب کی ابتدا اور اس کا نشوونما آخری تین صدیوں میں ہوا اور اس وقت سے اب تک انسان کے بارے میں جہالت بدستور

ہے۔ انسان کے بارے میں صرف وہی بات صحیح اور درست ہو سکتی ہے۔ جو اس کے خالق نے بتلائی ہو۔ اور جدید مادی تہذیب کے مزاج میں کلیسا بیزاری اور مذہب دشمنی موجود ہے۔

## تہذیب جدید میں انسانیت کی تحقیر

خالقین تہذیب جدید کو انسان کی تکریم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کا کوئی اقدام ان کو انسان کا وہ مقام یاد دلاتا ہے جو اسے مذہب نے دیا ہے۔ اور یورپ میں سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں ہو سکتا کہ مذہب کا کسی مقام پر تذکرہ آئے۔ یا انسان کی تمدنی حالت، یا اجتماعی اور معاشی نظام یا اس کے عملی تعلقات و ضوابط اور فنی طریقوں سے مذہب کا کوئی ربط ہو۔ بلکہ ان کو اس بات کا انتہائی شدید شوق ہے۔ کہ انسانیت کی تحقیر کریں۔ اسے گندگیوں میں ملوث کریں۔ اسے حیوان اور جنس کی نجاست میں لتھڑا ہوا بتائیں اور اسے مادہ کے جبری قوانین اور اقتصاد کی قوت قاہرہ کے سامنے مغلوب ظاہر کریں۔ جیسے تہذیب جدید کے صانعین انسانیت کے دشمن ہوں۔ اور انہیں انسانیت کو گندگیوں میں لتھڑا ہوا دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہو ——— یہ سب کچھ انھوں نے اس لئے کیا تاکہ کلیسا کو مخاطب کر کے کہہ سکیں۔ کہ یہ تیرا خدا اور یہ تیرا مذہب ہے۔ اور یہ وہ انسان ہے جس کے بارے میں تیرا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے! جب یہ صورت حال ہے تو کلیسا کو ہماری عملی زندگی سے قطعاً علیحدہ ہو جانا چاہیئے!

اس المیہ کے اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ تہذیب جدید ابتدائً ان تجربی اور علمی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ جو اندلس اور اسلامی شرق سے یورپ تک پہنچی تھیں۔ اور جو قرآنی آیات سے ابھری تھیں۔ کیونکہ قرآن تو اس کائنات میں تدبر اور زمین کی پوشیدہ قوتوں کے استعمال کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ نیز اس تہذیب کی بنیاد اسلام کی انسانی اور واقعی منہاج پر بھی تھی ——— مگر جب یہ تمام سرمایہ یورپ پہنچا تو یہ اپنی فلسفیانہ بنیادوں کے ساتھ نہیں پہنچا۔ بلکہ صرف علوم فنی طریقوں اور تجربی مناہج کی شکل میں آیا۔ اور بالآخر مذہب اور تہذیب جدید میں "بدترین پیکار" قائم ہو گئی۔

اس لئے اس تہذیب میں اس انسان جس کے لئے یہ تہذیب تخلیق ہوئی اور جو اس کا صانع تھا ———

اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا چنانچہ یہ تہذیب انسان کے لئے نامناسب بن گئی۔ اس نے انسان کی ان بنیادی خصوصیات کو کچل ڈالا۔ جو انسان کو کائنات میں منفرد اور جداگانہ تشخص کرتی تھیں۔ اور جن کی بدولت انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اپنا کردار ادا کرے۔ بلکہ اگر کسی اجتماعی یا اقتصادی نظام یا کسی تہذیب میں ان خصوصیات میں سے بعض کی طرف سے بھی غفلت برتی جائے۔ تو بھی انسانی وجود میں اختلال پیدا ہوگا اور نہ صرف یہ کہ اس کے وہ ہی پہلو مٹ جائیں گے جن کی طرف سے غفلت برتی گئی تھی۔ بلکہ اس کے دوسرے پہلو بھی ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ انسانی نظام مرکب اور باہم پیوست ہے۔ وہ ایک وحدت کی طرح حرکت کرتا ہے۔ اور تجرباتی اور عقلی بحث کے علاوہ اس کے اجزاء علیحدہ علیحدہ نہیں پائے جاتے۔

**تہذیب جدید پر مغربی سائنسداں کا تبصرہ** تہذیب جدید کی نشاۃ۔ اور انسانی اور انسانی خصوصیات سے اس کی عدم مناسبت کے بارے میں الیکسس کیرل کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"تہذیب جدید انسانیت کے نامناسب اور بڑے مشکل مرحلے میں ہے۔ اس تہذیب کا ہماری طبیعت کی حقیقی معرفت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی پیدائش میں کچھ علمی دریافتیں، لوگوں کی خواہشات و اوہام اور بعض نظریات و افکار کا حصہ ہے۔ باوجودیکہ یہ ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ انسانیت کے حجم اور شکل پر بالکل منطبق نہیں ہوتی۔" ص ۳۸

"صنعتی زندگی کی تنظیم میں مزدوروں کی عقلی اور عضویاتی حالت پر کارخانے کے اثرات کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ موجودہ صنعت اس اصول پر قائم ہے کہ "کم سے کم اخراجات میں زیادہ سے زیادہ پیداوار کی جائے تاکہ فرد یا گروہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ سکے" ۱ ـــــ اس اصول کو وسعت تو دی گئی مگر ان انسانوں کی طبیعت پر غور نہیں کیا گیا۔ جو مشینیں چلاتے ہیں۔ اور ان اثرات کے بارے میں بھی نہیں سوچا گیا۔ جن کو صنعتی زندگی پیدا کرتی ہے۔ اور کارخانے انہیں افراد اور ان کی اولاد پر مسلط کرتے ہیں۔" (ص ۴۰)

---

۱۔ مزدور کی عقلی اور عضویاتی حالت پر مرتب ہونے والے کارخانے کے اثرات میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پیداوار قوم کی ملکیت ہے ـــ یا قوم کے ایک طبقے کی ـــ یعنی حکومت کی ـــ کیونکہ محنت کا طریقہ بہرحال ایک ہی ہے۔

"یہ نظریہ پرست جو تہذیبیں بناتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ انسان کی بھلائی ہی کے لئے ہوتی ہیں۔ مگر وہ صرف انسان کی نامکمل یا مبالغہ آمیز تصویر کے مطابق ہوتی ہیں۔ حکومتوں کے جو نظام "مفکرین" نے اپنی عقل سے تراشے ہیں۔ ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے خیالات صرف جامد لوگوں ہی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ ہمیں انسانی روابط پر مشتمل قوانین کا کوئی علم نہیں ہے اور علوم اجتماع اور اقتصادیات صرف تخمینی اور فرضی علوم ہیں۔" (ص ۴۴)

"ہر شے کا پیمانہ خود انسان کو ہونا چاہیئے مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔ انسان بیچارہ خود اپنی پیدا کردہ دنیا میں اجنبی ہے۔ وہ اپنی دنیا کو از خود منظم نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنی طبیعت کی عملی معرفت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم حیات کے بالمقابل علوم جمادات میں انسان کی بے اندازہ ترقی خود اس کے لئے مصیبت بن گئی ہے۔ اب جو ماحول خود ہماری عقل اور ہماری ایجادات کا پیدا کردہ ہے۔ وہ ہمارے ڈھانچہ اور ہمارے قوام کے لئے نامناسب ہے۔ ہم بڑے بدنصیب ہیں۔ کیونکہ ہم عقلی اور اخلاقی دیوالیہ پن سے دوچار ہیں۔

جو جماعتیں اور قومیں آج صنعتی تہذیب میں ترقی کی بام عروج پر پہنچ چکی ہیں یہی قومیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں اور یہی اقوام سب سے پہلے بربریت اور وحشیت کی جانب لوٹیں گی! مگر اس کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا کیونکہ سائنس نے اس تہذیب کے گرد جس قسم کے بدترین حالات پیدا کر دیئے ہیں ان سے بچانے والا کوئی نہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تمدن نے بھی گزشتہ تمام تمدنوں کی طرح زندگی کے ایسے معین حالات پیدا کر دیئے ہیں جو بذات خود زندگی کے وجود کو محال بنا دیتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے اسباب کا ابھی تک علم نہ ہو سکا (ص ۲۲، ۲۱)

باوجودیکہ تہذیب جدید نے اپنے سفر کا آغاز بڑی خوش کن امیدوں کے ساتھ کیا تھا مگر یہ تہذیب ایسے انسان پیدا کرنے میں ناکام ہو چکی ہے جن میں کسی قدر عقل و جرأت ہو اور وہ اس تہذیب کی ڈوبتی نیا کو پار لگا سکیں کیونکہ انسان نے اس قدر تیز ترقی نہیں کی ہے جس قدر تیز ترقی تہذیب جدید کے ساختہ عقلی نظاموں نے کی ہے چنانچہ دور جدید کی قومیں جس خطرے سے دوچار ہیں اور جس سے ان کے سیاسی زعماء فکر مند ہیں۔ وہ ان قوموں کا اخلاقی اور عقلی زوال ہے۔ (ص ۲۷)

عقل، قوت ارادی اور اخلاق آپس میں باہم مربوط ہیں۔ البتہ اخلاقی احساس عقل سے زیادہ

اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ احساس کسی قوم سے نکل جاتا ہے۔ تو اس کا اجتماعی وجود رفتہ رفتہ ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ (ص ۱۶۰)

(۹) تہذیب جدید عقلی عمل کے مناسب کوئی ماحول پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اکثر لوگوں کے عقلی اور روحانی زوال کا سبب وہ نقائص ہیں جو ان کی نفسیاتی فضا میں موجود ہیں۔ کیونکہ مادہ کی برتری اور "صنعتی مذہب" کے اصولوں نے ثقافت، جمال اور اخلاق کو پامال کر دیا ہے (ص ۱۸۴)

**اخلاقی احساس کا خاتمہ**

(۱) جدید معاشرہ اخلاقی احساس سے بالکلیہ دستبردار ہو چکا ہے اور اس احساس کے مظاہر تک کو مٹا چکا ہے۔ کیونکہ ہم ذمہ داریوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ جو لوگ خیر و شر میں امتیاز رکھتے ہیں اور محتاط ہو کر کام کرتے ہیں وہ تنگدست رہتے ہیں اور لوگ انہیں بڑی تنگدلی اور افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ آج جو عورت اپنے آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دے اور اپنا کچھ زیادہ خیال نہ رکھے اسے کمزور عقل مقصود کیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی اور بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ سرمایہ پس انداز کرے تو یہ سرمایہ کسی نہ کسی بہانے سے کاروباری سرمایہ دار یا حکومت اچک کر لے جائے گی۔ (ص ۱۸۵)

وحشیانہ مادیت نہ صرف یہ کہ عقلی ارتقار کی راہ میں رکاوٹ ہے بلکہ نرم خو، شریف، کمزور اور تنہا شخص کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو ختم کر دیتی ہے جو ذوق جمال رکھتے ہیں اور جنہیں دولت کے علاوہ کچھ اور اشیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (ص ۲۷۱)

علم، جمال اور مذہب کا ارتقار رک جانے کی بناء پر ایسے کمینے لوگ ابھر آئے تھے جو کج فہم اور مریضانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ باوجودیکہ عقلی تربیت ہر شخص کو میسر ہے۔ مگر پھر بھی اس قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ شعور جمال اور احساس مذہب پیدا کرنے کے لئے کسی بلند ترین ثقافت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ یہ ثقافت عالیہ فنکار شعرار، اہل مذہب اور دوسرے مطالعہ جمال کرنے والوں کے لئے ضروری ہے۔ یہی بات اخلاقی احساس اور اصابت رائے کے بارے میں بھی درست ہے۔

یہ تمام متنوع اعمال بذات خود کافی ہیں۔ ان کے لئے انسانی صلاحیتوں کو سعادت کے لئے

تیار کرنے میں کسی تیز فہمی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان اعمال کا ارتقاء ہی بذات خود تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد ہونا چاہیے تاکہ فرد میں توازن قائم ہو سکے۔ یہ متنوع اعمال اجتماعی عمارت کا سنگ بنیاد ہیں ان لوگوں کے لیے جو صنعتی تہذیب کی افزائش میں مصروف عمل ہیں انہیں ہوشیاری سے زیادہ اخلاقی احساس کی ضرورت ہے۔ (ص ۱۶۸-۱۶۹)

اکثر افراد کا ذوق جمال پامال ہو چکا ہے۔ کیونکہ صنعتی تہذیب نے انہیں اپنے جملہ بدنما کریہہ اور سخت مناظر کے ساتھ گھیرے میں لیا ہوا ہے یہ لوگ مشین بن چکے ہیں۔ ایک ہی مزدور ایک ہی دن میں ایک ہی قسم کی حرکات ہزاروں مرتبہ کرتے ہوئے پوری زندگی بسر کر دیتا ہے۔ وہ مصنوعات کے اجزاء بناتا ہے۔ کوئی مکمل شئے نہیں بناتا کوئی گویا اسے اپنی عقل کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی مثال کولہو کے بیل کی سی ہے جو سارے دن ایک ہی دائرہ میں گردش کرتا رہتا ہے۔ صنعت نے انسان کو اس عقلی عمل سے محروم کر دیا ہے جس سے انسان کے لیے اپنی یومیہ زندگی میں لطف اندوز ممکن تھا تہذیب جدید کی یہ بدترین غلطی ہے کہ اس نے عقل کو مادہ کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ ایسی ہولناک غلطی ہے جس کے خطرات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی اس کے مدمقابل آنے کی ہمت نہیں کرتا اور سب نے اسکو اس طرح قبول کر لیا ہے جیسے انہوں نے بڑے بڑے شہروں کی مضر صحت زندگی اور کارخانوں کی قید و بند کو قبول کر لیا ہے۔ جو لوگ اپنے اعمال میں احساس جمال کا ابتدائی شعور رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو صرف پیداوار کرتے ہیں کیونکہ پیداوار سے انہیں استقلال کی سہولت میسر آتی ہے موجودہ صنعت نے کارکن کو ابداع اور جمال کے شعور سے محروم کر دیا ہے ہماری تہذیبی خشونت اور مصیبت کی جزئی وجہ وہ انحطاط ہے۔ جو ہماری زندگی پر چھایا ہوا ہے اور جو جمال سے لطف اندوز ہونے کے بہت ہی کم مواقع مہیا کرتا ہے (ص ۱۶۱-۲۶۲)

جدید معاشرہ فرد سے ناواقف ہے۔ وہ اپنے حساب میں بنی نوع انسان کو شمار نہیں کرتا۔ وہ صرف کائناتی حقیقتوں پر ایمان رکھتا ہے اور لوگوں سے اس کا تعامل بطور خلاصہ ہے۔ فرد اور بنی نوع انسان کے بارے میں صنعتی تہذیب کے اضطراب نے اسے ایک بڑی غلطی میں پھنسا دیا ہے اور عوایہ کردہ

لوگوں سے برتاؤ مقررہ اصولوں پر کرتی ہے اگر تمام انسان مساوی ہوتے تو ان کی تربیت، زندگی اور عمل بکریوں کے گلے کی شکل میں ہوتا حالانکہ ہر انسان جداگانہ شخصیت کا مالک ہے اور ایک رمز کی طرح تعامل ممکن نہیں ہے (ص ۲۱۸)

## اولاد کی تربیت میں خاندان کی اہمیت

جدید معاشرے نے ایک بڑی غلطی یہ کی ہے کہ تربیت کا کام خاندان سے لے کر اسکول کو دے دیا چنانچہ مائیں اپنے بچوں کو پرورش گاہوں میں چھوڑ کر اپنے کاموں اور اجتماعی دلچسپیوں کے لئے چل دیتی ہیں یا بازار جاتی ہیں۔ ادبی اور فنی ذوق پورے کرتی ہیں۔ برج کھیلتی ہیں اور سینما جاتی ہیں غرض یونہی اپنے اوقات ضائع کرتی ہیں دراصل عورتیں ہی خاندان کے مٹ جانے کی ذمہ دار ہیں اور ان خاندانی اجتماعات کی بھی جن میں بچے بڑوں کے ساتھ بیٹھ کر بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ اگر کتے کے بہت سارے پلے ایک جگہ بند کر دیئے جائیں تو وہ اس قدر نشوونما نہیں پا سکتے جس قدر وہ پلے بڑھتے ہیں جو اپنے ماں باپ کے ساتھ آزادانہ گھومتے ہیں یہی فرق انسانوں کے ان بچوں میں بھی ہے جو اپنے ہم عمروں میں گھرے رہتے ہیں۔ کیونکہ بچہ عضویاتی، عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے اپنے گرد و پیش سے بڑا متاثر ہوتا ہے وہ اپنے ہم عمر بچوں سے بہت ہی کم سیکھ پاتا ہے اور اگر وہ اسکول میں صرف اپنے ہم عمروں میں رہے تو وہ نامکمل رہے گا۔ فرد کو مکمل طور پر قوت حاصل کرنے کے لئے کسی قدر عزلت اور کسی قدر اجتماعیت کی ضرورت ہے جو خاندان فراہم کرتا ہے۔ (ص ۲۱۸۔ ۲۱۹)

لوگوں میں ناپختگی کی ذمہ دار وہ اجتماعی تنظیمات ہیں جنہوں نے فرد کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ انسان زندگی کی یکسانیت اور اس مشابہت عمل کو برداشت نہیں کر سکتا جو دفاتر اور کارخانوں کے ملازمین اور مزدوروں کو اور ان تمام لوگوں کو کرنا ہوتا ہے جو تنظیم ترپیداوار (Mass production) میں شریک ہوتے ہیں۔

الیکسس کاریل کی تمام کتاب میں اسی قسم کی توضیحات ہیں ہم نے اس کتاب سے جو اقتباسات دیئے وہ تمام کے تمام اس احساس پر مشتمل ہیں۔ کہ موجودہ تہذیب انسان، اس کے

ذاتی مقویات اور خصوصیات کے لئے ایک خطرہ ہے۔

**تہذیب جدید زوال پذیر ہے** آخر میں وہ درج ذیل جملے تحریر کرتا ہے۔ جس میں تنبیہ کا انداز زیادہ نمایاں ہے اور ایک سائنسداں ہونے کے باوجود اس کی ان سطور میں مذہبی تنبیہات کا رنگ جھلکتا ہے۔

| انسان وراثت اور ماحول کی پیداوار ہے اس کی زندگی اور فکر کی عادات وہ ہی ہیں جو جدید معاشرے نے اس پر مسلط کر دی ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ یہ عادات کس طرح انسان کے جسم اور شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ ٹکنالوجی نے جو ماحول بنایا ہے انسان اس سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکتا اور یہ ماحول اب روبہ زوال ہے۔ موجودہ حالت کی ذمہ داری سائنس اور ٹکنالوجی پر نہیں بلکہ خود ہم پر ہے۔ کیونکہ ہم جائز اور ناجائز میں فرق نہیں کرتے۔ قوانین طبیعت کو توڑ کر ہم نے بڑی غلطی کی ہے ایسی غلطی جس کی سزا سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ سائنسی مذہب اور صنعتی آداب حیاتیاتی حقیقت کے بالمقابل شکست کھا چکے ہیں۔ جب بھی کبھی انسان زندگی کے ممنوع علاقوں میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے زندگی انسان کی قوتوں کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اسی لئے موجودہ تہذیب زوال پذیر ہے کیونکہ علوم جمادہمیں ممنوع علاقے میں لے گئے اور ہم ان کی ہدایت پر بغیر دیکھے بھالے چلتے رہے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد کمزور، بدکار اور غبی ہو گیا اور اسے اپنے نفس پر کوئی قدرت حاصل نہ رہی۔

(ص ۲۲۲)

**انسان کی تخلیق نو** اس تنبیہ کے بعد مصنف اپنی کتاب کے باب "انسان کی تخلیق نو" میں ایک اور تنبیہ کرتا ہے۔

| ہمیں اس انسان کی تخلیق نو کرنا ہو گی جس کو جدید زندگی اور موضوعی مقابلوں نے نکما بنا دیا ہے دونوں صنفوں کی تجدید بھی از سر نو ہے۔ ہر فرد یا مذکر ہو یا مونث۔ کسی صنف میں بھی دوسری صنف کی عقلی صفات، جنسی میلانات اور شوق ظاہر نہ ہونے چاہئیں۔ بجائے اجتماعی شکل میں مشین کی طرح پیداوار کرنے کے انسان کو اپنی وحدانیت کا اثبات کرنا چاہیئے۔

شخصیت سازی کے کام کے لئے ہمیں موجودہ اسکول، کارخانے اور دفاتر ختم کرتے ہوں گے بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس تکنیکی تہذیب کے اصولوں کو اٹھا کر پھینک دیں۔ (ص ۲۶۸)

الیکسس کیرل اپنی کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہے۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہے جو یہ احساس کرسکیں کہ عقلی سیاسی اور اجتماعی تغیرات ناگزیر ہو چکے ہیں اور موجودہ صنعتی تہذیب کو بدل کر اس کی جگہ انسانی ترقی کی ضامن نئی فکر لانا ضروری ہے۔ (ص ۱۱۲)

ہم نے ڈاکٹر کیرل کی کتاب "انسان نامعلوم" سے بکثرت اقتباسات اس لئے نقل کئے ہیں۔ کہ یہ اقتباسات ایک ایسے سائنسدان کے ہیں۔ جو اپنے موضوع سے پوری طرح واقف ہے اور جس تہذیب کے خلاف اعلان بغاوت کر رہا ہے۔ اسکی نشو و نما اسی تہذیب کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اور وہ سائنس پر یقین رکھنے کے باوجود اپنے عجز اور قصور کا اعلان کر رہا ہے۔

بہرکیف یہ اقتباسات اس امر پر مضبوط دلیل ہیں کہ یہ تہذیب انسان کے نامناسب ہے۔ کیونکہ یہ انسان کی طبیعت سے ناواقف ہے اور اس تہذیب میں انسانی خصوصیات کی کوئی رعائت اور انسان پر نازل ہونے والی مصیبتوں کا کوئی تدارک موجود نہیں ہے۔

اس تہذیب میں اور عظیم تر پیداوار کے راستہ میں انسان کی نوعی خصوصیات اس کی انفرادی خصوصیات اور اس کی صنفی خصوصیات سب ضائع ہوگئیں اور اس پیداوار کا سارا نفع چند دولت کے بھوکوں کو مل جاتا ہے۔ زیادہ بہتر حالت میں انسان اپنی خصوصیات مادی سہولتوں کی خاطر برباد کر دیتا ہے یہ سہولتیں انسان کے لئے فائدہ مند ضرور ہیں مگر ایسی شئے نہیں ہیں کہ اس کے لئے انسان کی انسانیت، اس کے نوعی خصائص: اس کی واضح انفرادیت، مرد و زن، خاندان اور بچوں کی خصوصیات غرضیکہ تمام مقویات زندگی کو داؤ پر لگا دیا جائے۔

تہذیب جدید اور اس پر قائم ہونے والی زندگی کے بارے میں ہمارا تمام تر ماخذ صرف یہی سائنسدان نہیں ہے اور نہ ہم اس سائنسدان کے نقطۂ نظر سے پوری طرح متفق ہو بلکہ

ہمارے اور اس کے درمیان مرض کی تشخیص اور موقف کے اختیار میں بڑا فرق ہے اور طریقہ علاج میں یہ اختلاف اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم آخری باب میں بیان کریں گے۔

چنانچہ یہ سائنسدان اپنی ساری وسیع النظری، فراخ دلی اور علمی اخلاص کے باوجود اپنی تمام فکر میں اپنے تہذیبی ماحول اور اپنے فکری شعوری اور تاریخی ورثے کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ جس سے وہ پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ اگرچہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہے۔

مثال کے طور پر وہ بتاتا ہے کہ جو افراد تہذیب جدید میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا مذہبی جذبہ سرد ہو کر رہ گیا ہے اور کمتر درجہ کے لوگوں پر مذہبی جذبہ کا افقار کا گہرا اثر ہوا ہے۔

مذہبی جذبہ کی جو معین صورت اس کے ذہن میں ہے اور جس کی اس کی کتاب میں متعدد مقامات پر مثالیں ملتی ہیں۔ وہ عقیدہ کے صرف روحانی طور پر اختیار کرنے والی صورت ہے۔ جیسے کہ فرد اپنے فنی جمالی اور اخلاقی ذوق کو بروئے کار لاتا ہے۔ اسی طرح مذہبی جذبہ بھی ہے اور فرد اس کو بھی روبعمل لے آئے گا۔

مذہب کی یہ شکل پورے یورپ میں چھائی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی روحانی جذبہ ہے۔ جو نماز، دعا اور مناجات میں جلوہ گر ہوتا ہے یا فرد عقیدہ کی کوئی اور روحانی اور شخصی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

چنانچہ کاریل صنعتی تہذیب میں یہی عیب بتاتا ہے۔ کہ اس کی بنا پر یہ مذہبی جذبہ سرد ہو گیا ہے باوجودیکہ کاریل کا شعور اور اس کی روح مذہب کے بارے میں صاف ستھری اور پاکیزہ ہے اور وہ اس ضمن میں ذاتی تجربات بھی رکھتا ہے مگر وہ ہماری طرح مذہب کو ضابطۂ حیات کی شکل میں پیش نہیں کرتا جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔

وہ مذہب کا صرف ایک ہی پہلو بتاتا ہے۔ حالانکہ مذہب ایسا ضابطۂ حیات ہے۔ جو روحانی پہلو پر بھی اسی طرح محیط ہے۔ جس طرح وہ فنی جمالی اور اخلاقی پہلوؤں پر چھایا ہوا ہے

اور جیسا کہ اس کے دائرے میں اجتماعی اقتصادی اور تہذیبی نظام بھی آجاتے ہیں۔ زندگی کے تمام جذبات اور حیات انسانی کے تمام پہلو مذہب ہی سے ابھرتے ہیں اور مذہب ہی پر مرتکز ہوتے ہیں۔

## اللہ کا انکار تہذیب جدید کی بنیاد ہے

تہذیب جدید کا جرم، اس کے فساد کا بنیادی سبب اور انسانی اقدار اور خصوصیات اور فرد کے مقومات کے زوال (جن پر کاریل تنقید کرتا ہے) سب کا راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ تہذیب جدید مذہب کو اللہ کا مقرر کردہ ضابطہ حیات ہونے کی صورت میں وہ سارا اقدار و اختیار نہیں دیتی جو اسے ملنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں تہذیب جدید اللہ کی الوہیت سے منکر ہے۔ اللہ کی الوہیت کا انکار اس کے مقرر کردہ ضابطہ حیات کو چھوڑ کر نیا ضابطۂ حیات اپنا کر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اشتراکیوں کی طرح علانیہ خدا کا انکار نہیں کیا گیا مگر انسانوں کا مقرر کردہ ضابطۂ زندگی اپنانا اللہ کے وجود سے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ سے انکار اس تہذیب کی بنیادوں میں شامل ہے۔ جس کے کچھ اسباب یورپ کی تاریخ سے اور کچھ اسباب مسیحیت کی تاریخ سے متعلق ہیں۔

تحریک احیاء کے وقت سے اللہ کے وجود سے انکار، اور یورپ کی رومی وثنیت کیجانب رجوع کی بناء پر جدید تہذیب لادینی بنیادوں پر اٹھی اسی سے تمام آفتیں نازل ہوئیں۔ انسان کیخلاف تہذیب جدید کا سب سے بڑا جرم اسی مصدر خبیث سے پھوٹا اور انسانی اقدار اور اس کے نوعی اور انفرادی خصائص کے زوال کی جڑ بھی یہی ہے۔

"اس تشخیص" کی بناء پر ہم ڈاکٹر کاریل سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم تہذیب جدید کے شجر خبیث کی جڑیں نکال دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ صرف شاخوں کی چھٹائی کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ علوم انسانی علوم مادہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جس مذہبی جذبہ کو اس تہذیب نے کچل دیا ہے۔ ہم اسے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط خیال کرتے ہیں۔

تشخیص کے ساتھ ہی ہمارا طریقۂ علاج بھی مختلف ہے۔ مگر اس موضوع کو ہم اپنی کتاب کے آخری باب "راہ نجات" میں بیان کریں گے۔

بہرکیف ہم نے ڈاکٹر کاریل کی زبانی متعدد مظاہر بیان کرکے تہذیب جدید کا کھوکھلا پن واضح کردیا ہے۔

کاریل ایک بڑا سائنسدان ہے۔ وہ مطالعہ تشخیص اور علاج میں سائنس پر اعتماد کرتا اور تہذیب جدید کے مظاہر کو ادراک سلیم اور خلوص سے بیان کرتا ہے۔

# فطرت کا انتقام

———— انسان اپنے رب سے، رب کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت سے روگرداں ہوگیا۔ اس نے اپنے نفس اور اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ انسان اپنے آپ سے ناواقف ہوکر بغیر نشانِ راہ پائے بھٹکتا رہا۔ اس نے اپنے جہل اور ہوائے نفس کے مطابق اپنی زندگی کا قانون بنایا۔ اس نے اپنے رب سے اپنی فطرت سے اور اپنے رب کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات سے بھٹک کر اس فطرت پر بڑا ظلم کیا جس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و تکریم عطا کی اور انسان نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اللہ نے اسے انسان بنایا مگر اس نے اپنے آپ کو حیوان تصور کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مشین کا خالق بنایا مگر وہ خود مشین بن گیا بلکہ مشین کو اپنا صاحب ارادہ الٰہ بنا لیا اور مادہ کو بھی اپنا الٰہ بنا لیا اور اقتصاد کو بھی الٰہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انسان مادہ اور اقتصاد دونوں کا آقا ہو مگر انسان نے اس تکریم کو ٹھکرا دیا تاکہ وہ کلیسا اور کلیسا کے خدا سے نجات پا سکے!

انسان نے عورت کو حیوان لطیف اور مرد کو حیوان قوی بنایا اور ان کے ملاپ کا مقصد لذت و لطف گردانا اور یہ بات فراموش کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کو بلند تر بنایا اس کو پاکیزہ اور مطہر بنایا اس سے زندگی کے تسلسل اور ترقی کو وابستہ کیا۔ تمدن انسانی کی بنیاد اس تعلق پر رکھی خاندان کو مستقبل کی پرورش گاہ، عورت کو بہترین تخلیق کا نگران اور انسانیت کا محافظ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے عورت کو صرف لذت کوشی کی خاطر پامال ہونے اور کارخانوں میں مادی پیداوار میں مشغول ہونے سے محفوظ کر کے اسے گھر میں رہ کر انسانیت کی تخلیق اور اسکے تحفظ پر مامور کیا۔

انسان نے اپنی انسانی خصوصیات کو معطل کر دیا تاکہ اس کی ساری قوتیں مادی پیداوار پر صرف ہو سکیں۔ اس نے اپنی ساری زندگی مادی تصورات اور مادی بنیادوں پر استوار کر لی۔ انسان نے اپنے ان روحانی اور لطیف پہلوؤں کو کچل ڈالا۔ جو اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نظر میں انسان ہی کائنات میں ایسی منفرد مخلوق تھا۔ جس میں روح و مادہ کا حسین ترین امتزاج ہو سکتا ہے۔

انسان نے اپنے نظام کی بنیاد سود پر رکھی۔ تاکہ ساری انسانیت ان چند ہزار مالیاتی اداروں اور سودی بنکوں کے موسیس کی خدمت میں لگی رہے۔ اور ان سود خواروں کے پاس دنیا بھر کے انسانوں کی محنتوں کا ماحصل پہنچتا رہے۔ اور وہ پرشکوہ دفاتر میں چھپے بیٹھے رہیں اور اقتصادی نظریات اور رسل و رسائل کے تمام ذرائع ان کی تائید کرتے رہیں!

انسان نے اللہ کو چھوڑ کر سینکڑوں الٰہ بنائے۔ اس نے دولت کو معبود بنایا، ہوائے نفس کو خدا سمجھا، مادہ کو الٰہ بنایا، مادی پیداوار زمین اور جینس سب کو خدا بنالیا۔ اور اس نے اپنے قانون سازوں کو الٰہ بنایا جنہوں نے اللہ کا حق قانون سازی غصب کر کے اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بنالیا انسان نے ان تمام دیوتاؤں کی پرستش کی تاکہ وہ اللہ سے اور اللہ کی عبادت سے بھاگ سکے!

انسان کو اپنی تمام حرکات کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور یہ ناگزیر تھا کہ "فطرت کا انتقام" اس پر ٹوٹ پڑے اور انسان کو ندائے فطرت کی مخالفت پر رسوا کن اور تباہ کن تاوان دینے پر مجبور کر دے۔

چنانچہ انسان نے اپنے نفس، اعصاب اور صحت، اپنی خوش بختی اور طمانیت، اپنی صلاحیتوں اور خصوصیتوں اور اپنی دنیا اور آخرت ہر شئے سے تاوان ادا کر دیا۔

انسانیت نے فطرت کی خلاف ورزی پر اپنی زندگی کے ہر پہلو پر تاوان دیا اور جو قومیں مادی ترقی کے بام عروج تک پہنچ چکی ہیں ان کے لئے نسلی کمی خطرہ بنی ہوئی ہے۔

انسانی خصوصیات میں کمی انہیں بربریت کی طرف لے جا رہی ہے اور عقلی معیار میں کمی اس سائنس کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے جس پر تہذیب جدید کی بنیاد ہے۔ اور جو بالآخر

اس تہذیب کے زوال کا سبب بن جائے گی۔

صنعتی تہذیب میں غیر مفید انسانی صلاحیتوں کو کچلنے، مادی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں قلق اور پریشانی اور خدا ناشناس تمدن میں فلسفوں کے تھوپے ہوئے روحانی کھوکھلے پن کے آثار عصبی، عقلی اور نفسیاتی امراض، پاگل پن اور جنون اور شذوذ انحراف اور جرم کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔

اور انسان کی حیوانیت، مادیت اور سلبیت پر اصرار اور اس کی شہوتوں اور خواہشوں کو بے قید چھوڑ دینے کے نتائج اباحیت، لاپرواہی اور سلبیت کے نتیجہ میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور آمریتوں کے سامنے سرنگوں ہو کر اس پر رضامند ہو گیا ہے۔ کہ جانوروں کے گلے کی طرح زندگی گزارے اور سوائے جنسی ملاپ اور کھانے پینے کے کوئی مقصد نہ ہو۔

۱۲ انسانیت کو اپنے کردہ گناہوں کے سلسلے میں بڑے بھاری اور رسوا کن تاوان دینے پڑے ہولناک جنگیں جن کے نتیجہ میں لاکھوں انسان قتل اور زخمی ہوئے، سینکڑوں کی شکلیں مسخ ہو گئیں۔ اور کتنے ہی پاگل ہو گئے۔ مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔ پیداوار کم ہو تو بھی مصیبت زیادہ ہو تو بھی مصیبت، تجارتی بیلنس کم ہو جائے تو بھی مصیبت، زیادہ ہو جائے [illegible] مصیبت ٹیکس کم ہو جائیں تو مصیبت اور زیادہ ہو جائیں تو مصیبت، نسل کم ہو تو مصیبت [illegible] زیادہ ہو تو مصیبت ہر طرف بے راہ روی، قلق و پریشانی، حیرت و اضطراب اور عدم سکون [illegible] لوگوں کے اعصاب پر ناقابل برداشت دباؤ جس سے لوگ مر جاتے اور ان کے دماغ کی رگیں پھٹ جاتی ہیں، وہ پاگل اور مجنوں ہو جاتے ہیں۔ جیسے انہیں جن بھوت لپٹ گئے ہوں حالانکہ سب کچھ کیا دھرا ان کا اپنا ہے۔ اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تنبیہ گوش دل سے نہ سننے کا نتیجہ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (البقرہ۔ ۱۰۸) | اللہ کی نعمت پانے کے [illegible] قوم اسے شقاوت سے بدلتی ہے اسے [illegible] سخت سزا دیتا ہے۔ |

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ (البقرہ۔۱۰۸)

حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ۔ (الاعراف ۱۸۵۔۱۸۶)

اور اے محمدؐ! ان کے سامنے اس کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل گیا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والا میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى

مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے سود

فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللهِ وَ
مَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِي
الصَّدَقَاتِ وَاللهُ لَا يُحِبُّ
كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ۔

(البقرہ ۲۷۵-۲۷۶)

خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو
کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو
اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے۔ وہ
جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا
مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور
اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ
مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا
بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ

(البقرہ ۲۷۸-۲۷۹)

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا
سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے۔ اسے چھوڑ دو اگر تم
واقعی ایمان لائے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو
آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي
خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا
بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(سورۃ العصر)

قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارے میں
ہے مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اچھے کام کئے۔
اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اعمال
کی پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

## فردِ جرم۔ تہذیبِ جدید نے انسانیت کو کیا دیا

اب ہم مادی تہذیب کے اثرات ۔ بالخصوص ان اقوام میں رونما ہونے والے جو ترقی کے بام عروج پر پہنچ چکے ہیں ۔ کے بارے میں کچھ اقوال بطور ثبوت و شہادت نقل کریں گے ان اقوال میں انسانیت کے المیہ کے وہ چاروں عناصر آجائیں گے جن کی جانب ہم ابتداء میں اشارہ کر چکے ہیں۔

ہم نے یہ اقوال مختلف درجوں اور مختلف ماحول کے لوگوں کے جمع کئے ہیں۔ ان میں ایسے محقق سائنسدان بھی ہیں جو صرف سائنس پر یقین رکھتے ہیں اور انسانیت کے اس المیہ میں بھی سائنس ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ فلسفی بھی ہیں جو مذہب پر ایمان نہیں رکھتے مگر عقل کی روشنی میں انسانیت کو خطرے میں گھرا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ وہ محققین بھی ہیں جو مذہب پر ایمان، سائنس پر یقین اور عقل اور فطرت انسانی پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور وہ واقف ہیں کہ میدان علاج اور معرفت میں ان کی راہ نمائی کس قدر ہے۔ اور ان میں ایک خاتون ڈاکٹر ہے جو موضوع کی نزاکت سے بخوبی واقف ہے اور اسے محتاط طریقے پر بیان کرتی ہے۔ ایک صحافی ہے جسے بذات خود مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ایک صحافیانہ جائزہ پیش کرکے لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکاتا ہے۔

ہم نے درجنوں اقوال میں سے صرف مندرجہ ذیل نقل کئے ہیں۔ کیونکہ ایک ہی کتاب میں تمام اقوال نہیں بیان کئے جا سکتے۔

### الکسیس کاریل

الکسیس کاریل اپنی گفتگو کا آغاز انسان کی قوانین طبیعت ۔ (جس چیز کو اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ قوانین فطرت کہتے ہیں اسی کو وہ قوانین طبیعت کہتا ہے)۔ کی خلاف ورزی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے عواقب سے کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ جو بھی قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرے گا۔ وہ ان نتائج کو ضرور بھگتے گا اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو بلا سزا نہیں چھوڑا جائے گا۔

پھر کاریل بتاتا ہے کہ فی الواقع انسانیت کو اس خلاف ورزی کی سزا کس حد تک مل

چکی ہے۔

"اس کتاب کی ابتدا سے پہلے ہی مجھے اس کام کی دشواری کا پورا پورا احساس تھا بلکہ میں اسے ناممکن خیال کرتا تھا۔ مگر میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی نہ کوئی تو اسے ضرور انجام دے گا۔ اب لوگ زیادہ دیر تہذیب جدید کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اب یہ تہذیب انہیں زوال و انحطاط کی طرف لے جا رہی ہے۔ لوگ علوم جمادات کی دل کشی سے مبہوت ہو گئے ہیں۔ انھیں یہ خبر نہیں ہے کہ ان کا احساس اور شعور قوانین طبیعت سے متصادم ہو رہے ہیں۔ قوانین طبیعت اغماض تو برت سکتے ہیں۔ مگر سختی میں دنیاوی قوانین سے کم نہیں ہیں۔ اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر سزا ضرور دی جاتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ان کے کائناتی نظام سے، دوسرے ابن آدم سے اور اپنی داخلی ذات سے کیا تعلقات ہیں۔ ان کی وہ داخلی ذات جو ان کی نسلوں اور عقول سے وابستہ ہے۔ انسان دنیا کی ہر شے پر برملند ہے اگر خود انسان ہی زوال پذیر ہو جائے تو تہذیب کی ساری دلکشی اور مادی دنیا کی تمام تر عظمت چند لمحوں میں ختم ہو جائے ـــ انہی اسباب کی بناء پر میں نے یہ کتاب تحریر کی ہے"

(ص ۱۰ - ۱۱)

"انسان وراثت اور ماحول کی پیداوار ہے۔ اس کی زندگی اور فکر کی عادات وہی ہیں۔ جو معاشرے نے اس پر مسلط کر دی ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ یہ عادات کس طرح انسان کے جسم اور شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ ٹکنالوجی نے جو ماحول بنایا ہے انسان اس سے اپنے کو ہم آہنگ نہ کر سکا اور یہ ماحول اب رو بہ زوال ہے۔ موجودہ حالت کی ذمہ داری سائنس اور ٹیکنالوجی پر نہیں ہے۔ بلکہ خود ہم پر ہے کیونکہ ہم جائز و ناجائز میں فرق نہیں کرتے۔ قوانین طبیعت کو توڑ کر ہم نے بڑی غلطی کی ہے ایسی غلطی جس کی سزا سے بچاؤ ممکن نہیں ہے سائنسی مذہب اور صنعتی آداب حیاتیاتی حقیقت کے بالمقابل شکست کھا چکے ہیں۔ جب بھی کبھی انسان زندگی کے ممنوع علاقوں میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی انسان کی

قوموں کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اسی لئے موجودہ تہذیب زوال پذیر ہے۔ کیونکہ علوم جامد میں ممنوع علاقے میں لے گئے ہیں۔ اور ہم ان کی راہنمائی پر بغیر دیکھے بھالے چلتے رہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد بدکار، کمزور اور غبی ہو گیا اور اسے اپنے نفس پر کوئی قدرت حاصل نہیں رہی۔" (ص ۳۲۲)۔

" موجودہ تہذیب میں فرد کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اس جذبے میں بہت زیادتی ہو گئی ہے جو اسے عملی زندگی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آج فرد میں جہالت بھی ہے اور ذکاوت بھی برائے نام سی ہے۔ اس میں عقلی کمزوری بھی موجود ہوتی ہے جو ماحول کے اثرات کے ماتحت دور ہو جاتی ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اخلاق ختم ہو جائے تو عقل سالم نہیں رہ سکتی۔" (ص ۳۶)

" تہذیب جدید ایسے لوگ پیدا کرنے سے عاجز ہے جو خیال عقلمندی اور شجاعت کی موہوبی صفات کے حامل ہوں۔ عام معاملات میں ذمہ دار لوگوں کا عقلی اور اخلاقی معیار ہر ملک میں گرتا جا رہا ہے۔" (ص ۳۷)

" تمدن جدید میں ایسے افراد بہت کم نظر آتے ہیں۔ جو بلند اخلاقیات کے پابند ہوں۔" (ص ۱۶۱)

" جو لوگ اپنے اعمال میں احساس جمال کا ابتدائی شعور رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو صرف پیداوار کرتے ہیں۔ کیونکہ پیداوار سے انھیں استعمال کی سہولت میسر آتی ہے موجودہ صنعت نے کارکن کو ابتداع اور جمال کے احساس سے محروم کر دیا ہے۔" (ص ۱۶۲)

" عطف، جمال اور مذہب کا ارتقاء رک جانے کی بناء پر ایسے کمینے لوگ ابھر آئے ہیں۔ جو کج فہم اور حریصانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ باوجودیکہ عقلی تربیت ہر شخص کو میسر ہے۔ مگر پھر بھی اس قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔" (ص ۱۶۸)۔

" زیادہ تمدن یافتہ لوگ بھی شعور کی ابتدائی منزلوں میں نظر آتے ہیں وہ ایسے آسان سے کاموں پر قادر ہیں جو جدید معاشرے میں فرد کی زندگی کی ضمانت دے۔ وہ پیداوار کرتے ہیں اس کو استعمال کرتے ہیں اور اپنی عضویاتی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ لوگ جسمانی مقابلے اور بچکانہ فلمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بے مشقت تیز رفتار سفر سے خوش

ہوتے ہیں اور خاص طور پر جب تیزی سے حرکت کرتی ہوئی اشیاء پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ خوش و خرم جذباتی خواہش پرست لوگ اخلاقی اور مذہبی احساس اور شعور جمال سے قطعاً عاری ہیں۔"
(ص ۱۶۹)

"ذہنیائے شعور میں ہم آہنگی نہ ہونا ہمارے دور کا ایک ممتاز مظہر ہے۔" (ص ۱۷۰)

"عام طور پر فکر سے عضوی امراض پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ موجودہ زندگی کے عدم استقرار، مسلسل جذباتیت اور بدامنی شعور میں ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں جن سے عصبی اضطراب اور معدے اور آنتوں کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اسی سے سوزش گردہ اور امراضِ مثانہ پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب بیماریاں اخلاقی اور عقلی عدم توازن سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو لوگ سادہ زندگی گزارتے ہیں ان میں یہ امراض نہیں ہیں۔ نہ ہی ان میں جذباتیت اور مسلسل بے چینی پائی جاتی ہے اور جو لوگ اپنی باطنی ذات کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ اس پر شور تمدنی زندگی میں بھی عصبی اور عضوی امراض سے محفوظ ہیں۔" (ص ۱۷۷)

"عضویاتی عمل شعور کی حدود سے باہر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم عضویاتی ماحول میں دلچسپی لیں گے تو وہ جلد ہی اضطراب سے دوچار ہو جائے گا۔ تحلیل نفسی جب مریض کی عقل اس کی ذات کی جانب متوجہ کرتی ہے تو اس سے عدم توازن کی حالت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ انسان اپنی تحلیل نفسی میں مستغرق ہونے کے بجائے اپنی ذات سے فرار حاصل کرے مگر اس کوشش میں اس کی عقل پراگندگی کا شکار نہ ہو۔ کیونکہ اگر ہم اپنی دلچسپی کسی محدود مقصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ تو ہمارے عقلی اور عضویاتی اعمال میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ خواہشات کی وحدت اور عقل کے ایک مقصد کی جانب متوجہ کرنے سے ایک قسم کا داخلی امن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر انسان اپنے نفس کو فکر سے اسی طرح پراگندہ کر دیتا ہے جیسے عمل سے کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کو چاہیئے کہ وہ صرف سمندر، پہاڑ اور بادلوں کی خوبصورتی فنکار اور شعرا کی نادر تخلیقات، فلاسفہ کے اعلیٰ ترین اصول اور قوانین طبیعت کے حسابی

اعمال میں غور و فکر پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ اس کی روح بلند اخلاق تک پہنچنے کے لئے بھی کوشاں ہے۔ اور دنیائے تاریک میں نور کی کرن تلاش کرتا رہے، مذہب کے راستہ پر چلے، اور اپنے آپ کو اس دنیا کی غیر محسوس اساس سمجھنے کے لئے وقف کر دے۔ شعوری عمل کی وحدت دراصل عضویاتی اور عقلی اعمال میں بڑی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ان جماعتوں میں جن کا اخلاقی اور عقلی شعور بڑھ جاتا ہے ان میں عصبی اور ذہنی امراض جرم اور جنون بہت کم ہوتے ہیں اور ان جماعتوں کا فرد بھی زیادہ خوش باش ہوتا ہے" (ص ۱۷۷-۱۷۸)

تہذیب جدید عقلی عمل کے مناسب کوئی ماحول پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اکثر لوگوں کے عقلی اور روحانی زوال کا سبب وہ نقائص ہیں جو ان کی نفسیاتی فضا میں موجود ہیں۔ کیونکہ مادہ کی برتری اور صنعتی مذہب کے اصولوں نے ثقافت، جمال اور اخلاق کو پامال کر دیا ہے۔ جن سے مسیحی تہذیب اور جدید سائنس واقف ہے[۱] جیسا کہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں، عادات میں تغیرات ہونے کی بنا پر اپنی شخصیت اور اپنی مخصوص روایات کھو بیٹھی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے، اخبارات کی کثرت، سستے ادب اور ریڈیو سینما سے زوال پذیر ہو گئے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی طریقوں کے باکمال ہونے کے باوجود کند ذہن طبقہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ جہاں علمی ترقی ہو رہی ہے وہاں کند ذہنی بھی بڑھ رہی ہے۔

اسکولوں کے طلبا اور بچوں کی عقل ان رکیک پروگراموں سے تشکیل پاتی ہے جو عام لوگوں کی تسلی کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اس لئے اجتماعی ماحول عقل کو نشو و نما دینے کی بجائے پوری قوت سے اس کی مزاحمت کرتا ہے" (ص ۱۸۴)

---

[۱] مسیحیت یا جدید سائنس کے بارے میں یہ بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ کلیسا کی پیش کردہ مسیحیت نے عالم اسلامی سے یورپ پہنچنے والے علمی مناہج کا شدید ترین مقابلہ کیا اور مسیحیت کا یہ مقابلہ مذہب و سائنس اور مذہب و زندگی میں افتراق کا ایک بنیادی سبب ہے (اسلام دوراہے پر)۔ تالیف محمد اسد۔ عربی ترجمہ۔ عمر فروخ۔

" جنسی آداب کو ترک کر دینے کی بناء پر جنسی تشدد پھیلتا جا رہا ہے اور مردوں، عورتوں کی ازدواجی زندگیاں تحلیلی نفسیات کے ماہرین کے سامنے رکھی جا رہی ہیں۔ اب خطاء اور صواب اور عدل و جرم میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ مجرمین عوام میں بڑی آزادی سے رہتے ہیں اور کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ اہل مذہب نے مذہب کو راشن بنا کر ہر شخص کا حصہ لگا دیا ہے اور پوشیدہ بنیادوں کو ختم کر ڈالا ہے۔ مگر وہ پھر بھی نئی پود کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ یہ لوگ اپنے کلیسا میں ہفتہ کے نصف فارغ اوقات کمزور اخلاق والے لوگوں کو نصیحتیں کرنے میں کھپا دیتے ہیں۔

یہ مذہبی لوگ جو پولیس کا سا کردار ادا کر رہے ہیں یہ اسی پر مطمئن ہیں۔ بس دولت مندوں اور اور ان کے مفاد کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں۔ تاکہ موجودہ معاشرتی ڈھانچے کو برقرار رکھ سکیں یا پھر سیاستدانوں کی طرح عوام کی خوشامد کرتے رہتے ہیں!" (ص ۱۸۶)

"عقل جسم کی طرح طاقتور نہیں ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ تمام جسمانی امراض سے عقلی امراض زیادہ ہیں۔ اسی لئے دماغی ہسپتال بھرے پڑے ہیں اور ان میں مزید داخلے کی گنجائش نہیں ہے۔ س۔ د۔ بیرس کہتا ہے کہ نیویارک کے ہر بائیسویں (۲۲) شخص کو کسی نہ کسی وقت دماغی ہسپتال میں داخل کرنا پڑ جاتا ہے۔ امریکی اسپتال دماغی مریضوں پر ٹی بی کے مریضوں سے آٹھ گنا زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ہر سال دماغی ہسپتالوں میں چھیاسی ہزار (۸۶۰۰۰) افراد داخل کئے جاتے ہیں اور اگر پاگل پن کی یہی رفتار رہی تو آج جو لاکھوں بچے اور جوان اسکول اور کالج جاتے نظر آتے ہیں وہ جلد یا بدیر دماغی ہسپتالوں میں پہنچ جائیں گے!

سنہ ۱۹۳۲ء میں سرکاری ہسپتالوں میں پاگلوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار (۳۴۰۰۰۰) مخصوص ہسپتالوں میں فاترالعقل اور مرگی زدہ لوگوں کی تعداد اکیاسی ہزار پانچ سو اسی (۸۱۵۸۰) اور جن فاترالعقل لوگوں کو پیرول پر چھوڑا گیا ان کی تعداد دس ہزار نو سو تیس (۱۰۹۳۰) تھی۔ اور ان اعداد و شمار میں وہ مریض شمار نہیں ہیں جن کا پرائیویٹ ہسپتالوں میں علاج ہوا۔ پاگلوں کے علاوہ تمام ملک میں پائے جانے والے فاترالعقل لوگوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے (۵۰۰۰۰۰) "صحت عقلی کی قومی

انجمن نے نہایت توجہ سے تحقیق کرکے بتایا ہے کہ کم از کم چار لاکھ (......۴) بچوں کا عقلی معیار اس درجہ کم ہے کہ وہ عام اسکولوں میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہیں اور جن افراد میں عقلی اختلاط ہے ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے اور سینکڑوں سرکاری اعداد و شمار میں نہیں آئے نفسیاتی اضطراب سے دوچار ہیں[1]

یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ آج کا تہذیب یافتہ انسان تباہی کا کس قدر احساس رکھتا ہے اور عقلی صحت کا مسئلہ آج کے معاشرے کا اہم ترین مسئلہ بن چکا ہے۔ عقلی امراض ایک ہولناک خطرہ ہیں عقلی امراض ٹی۔بی سرطان اور قلب و جگر کے امراض سے زیادہ خطرناک ہیں۔ بلکہ یہ تپ محرقہ طاعون اور ہیضہ سے زیادہ خطرناک ہیں اس لئے عقلی امراض پر توجہ دینی چاہیئے اس لئے نہیں کہ یہ مجرمین کی تعداد میں اضافہ کا سبب ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ امراض سفید فام نسلوں کے امتیاز کو نقصان پہنچائیں گے۔[2] یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فاتر العقل اور مجنون اتنی کثرت سے مجرمین میں موجود نہیں ہیں جس کثرت سے وہ عوام میں پائے جاتے ہیں۔! یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے عقلی مریض قید خانوں میں نظر آتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر پاگل خاصے ثقافت آشنا ہوتے ہیں۔

اعصابی اور نفسیاتی مریضوں کی کثرت تہذیب جدید میں پائے جانے والے کسی خطرناک نقص پر دلیل ہے اور اس بات پر بھی کہ نئی تہذیبی عادات نے ہماری عقلی صحت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔" (ص ۱۸۷-۱۸۸)

"زندگی کی مخصوص شکلیں زوال کی طرف لی جارہی ہیں اور اجتماعی حالات سفید فام نسل کی ہلاکت کا سبب بن رہے ہیں۔" (ص ۲۶۴)

---

[1] یہ پرانے اعداد و شمار ہیں اور اب اس سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکے ہیں۔

[2] صرف سفید نسلوں کا خطرہ پریشانی قلب کا سبب بنا ہوا ہے۔ انسانی کی بدبختی میں مغربی عقل کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے۔ جس سے وسیع النظر سائنس دان بھی دامن نہ بچا سکا!

"کوئی بھی شخص موجودہ دور کے لوگوں کی شخصیت کے بارے میں سوال کر سکتا ہے۔! مگر کچھ مراقبین اس کے وجود میں شک کرتے ہیں چنانچہ تھیوڈر دریزر اسے دیومالائی کہانی خیال کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جدید شہری عقلی اور اخلاقی کمزوری میں بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا طرزِ زندگی یکساں ہے اور یہ سب اعصابی مریض، کند ذہن، مغرور خود اعتمادی سے محروم ہیں۔ عضلاتی طاقت رکھتے ہیں مگر جلد تھک جاتے ہیں۔ کمزوری اور شدودذ کے باوجود جنسی ہیجان میں مبتلا رہتے ہیں۔" (ص ۳۱۶)

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر کاریل کی کتاب سے لئے گئے مندرجہ بالا اقتباسات "انسان" اور تہذیب جدید سے متعلق ہیں۔ اب ہم وہ اقتباسات نقل کرتے ہیں جو تہذیب جدید میں عورت اور صنفی تعلقات اور اس کے نسل انسانی اور اس کے عقلی و اخلاقی معیار پر خطرات کے بارے میں ہیں۔

کاریل کہتا ہے:-

"ہمیں بنی نوع انسان کے مستقبل کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی کیفیت کا یقین کر لینا چاہیے۔ صنعتی تہذیب نے اسلاف کی روش میں جو ترمیمات کی ہیں اس کا عورتوں پر گہرا اثر ہوا ہے اور شرح پیدائش گھٹ گئی ہے۔ اس کے اثرات بڑے واضح اور اس کے نتائج اجتماعی طبقوں میں اور ان قوموں میں جنھوں نے علمی ایجادات کو اپنایا ہے اور ترقی کی دوڑ میں دوسری اقوام سے آگے نکل گئیں۔ بڑے خطرناک ہیں۔

"ضبط تولید" کا مسئلہ تاریخ عالم میں نیا نہیں ہے۔ بلکہ تمدنی مراحل میں انسانیت اس مرحلے سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔ یہ ایک علمی منظر ہے جس کے اثرات سے ہم واقف ہیں۔"[1] (ص ۳۷)

"عورت اور مرد میں فرق صرف تناسلی اعضاء، رحم اور حمل کے وجود اور طریقۂ تعلیم ہی کا نہیں ہے۔

---

[1] شاید مصنف کی مراد یونانی اور رومی تہذیب کے آخر میں رونما ہونے والے حالات ہیں۔ جو ان تہذیبوں کے زوال کا سبب بنے۔

بلکہ عورت اس سے زیادہ اہم ہے۔ بستوں کی ساخت ہی سے عورت کا وجود بن جاتا ہے۔ اور بچہ دانی سے نکلنے والے کیمیائی مواد سے اس کے سارے جسم کی پیوند کاری ہوتی رہتی ہے۔

حقوق نسواں کے علم بردار ان جوہری حقائق سے نا واقف ہیں۔ اس لئے وہ خیال کرتے ہیں کہ دونوں صنفوں کو یکساں تعلیم ملنی چاہیئے اور ان کو یکساں اقتدار اور یکساں ذمہ داریاں ملنی چاہئیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت مرد سے بہت مختلف ہے۔ اس کے جسم کا ہر خلیہ اس کے صنف کے اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ یہی حال اس کے اعضاء اور اعصابی نظام کا ہے۔ نظام شمسی کے قوانین کی طرح عضویاتی قوانین میں بھی کوئی لچک نہیں ہے۔ ان کو خواہشوں اور آرزوؤں سے نہیں بدلا جا سکتا۔ بلکہ وہ جیسے بھی ہیں ہم ان کو قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ عورتوں کو مردوں کی تقلید کے بجائے اپنی طبیعت کے مطابق اپنی اہلیت کو نشو و نما دینا چاہیئے۔ کیونکہ عورتوں کا فریضہ مردوں سے زیادہ اہم ہے۔ اس لئے عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے فرائض سے دست بردار نہ ہوں۔" (ص ۱۱۴)

"ماں اور باپ بچہ دانی کے اس جوہر کی تخلیق میں مساوی حصہ دار ہیں جس سے نئے جسم کے تمام خلیئے تیار ہوتے ہیں مگر ماں جوہری مادہ کا نصف فراہم کرنے کے علاوہ جوہر کو مادۂ حیات بھی دیتی ہے اس لئے جنین کی تخلیق میں ماں کا عمل باپ کے عمل سے اہم تر ہوتا ہے۔" (ص ۱۱۵)

"تناسل میں مرد کا عمل بہت مختصر ہے جب کہ عورت کا عمل نو ماہ جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں عورت کی رحم کی جھلیوں سے کیمیائی مواد جاری رہتا ہے جو بچہ کی غذا بنتا ہے۔ جب ماں جنین کی نسوں کی ساخت کے مناسب عناصر فراہم کر رہی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی اعضاء جنین سے خارج ہونے والے مواد کو اپنے اندر جذب کرتی رہتی ہے۔ یہ مواد کبھی نفع بخش ہوتا ہے اور کبھی خطرناک۔ حقیقت یہ ہے کہ جنین باپ سے بھی اسی قدر بنتا ہے جس قدر ماں سے۔ کیونکہ ایک اجنبی اصل کی مخلوق۔ جزئی طور پر۔ عورت کے جسم میں آجاتی ہے۔ اور عورت دوران حمل اس سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ کبھی جنین سے عورت میں زہر بھی سرایت کر جاتا ہے۔ مگر اس کے عضویاتی اور رسیائی زبداں اسے متوازن کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر عورت ایک یا دو حمل کے بعد پورا نما حاصل کر پاتی ہے اور جن عورتوں کے بچے نہیں ہوتے

وہ پوری طرح متوازن نہیں ہوتیں۔ بلکہ اعصابی بن جاتی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ چھوٹے ہونے کی بنا پر جنین کی نسلیں اور ماں کی نسلیں آپس میں مل جاتی ہیں اور چونکہ وہ باپ کی نسلوں کا بھی حصہ ہوتا ہے اس لئے ماں پر بڑے اثرات ڈالتا ہے ایک ماں کے لئے حمل اور وضع حمل کی اہمیت کو ابھی پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ عمل عورت کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے عورت کا ماں بننے سے گریز کرنا ایک رکیک حرکت ہے۔ اسی لئے لڑکیوں کو عقلی اور مادی تربیت نہ دی جائے اور نہ ان کے دلوں میں لڑکوں جیسی خواہشات کو ابھرنے کا موقع دیا جائے۔ تربیت کرنے والوں کو اس کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے کہ وہ عورت اور مرد کی عقلی اور عضوی خصوصیات اور ان کے طبعی وظائف پر توجہ دیں۔ دونوں صنفوں میں کافی فرق ہے اور اس فرق کو ایک متمدن دنیا کی تخلیق میں مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ (۱۱۶ - ۱۱۷)

"کس قدر تعجب کی بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں بچوں کی تربیت اور ان کی عضوی اور عقلی صفات سے متعلق درس کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ عورت کو اس کے طبعی وظیفہ۔ حمل اور بچوں کی تربیت سے روشناس کرانا بے ضروری ہے۔" (۳۶۸ - ۳۶۹)۔

" جنسی عمل کی افراط عقلی عمل میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہتر طریقے پر نشوونما پائے ہوئے جنسی غدود اور کچھ وقت کے لئے جنسی خواہش کو دبائے رکھنا کہ وہ پورے شباب پر آجائے عقل کے نما کے لئے ضروری ہے۔ فرائڈ نے شعوری عمل میں تحرکات جنسی کی اہمیت پر صحیح زور دیا ہے مگر اس کی آراء مریضوں سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس کے نتائج عام لوگوں پر منطبق نہیں کئے جاسکتے۔ اور خاص طور پر وہ لوگ جن کا عصبی نظام طاقتور ہے اور وہ اپنے نفس پر پورا کنٹرول رکھتے ہیں۔ جبکہ کمزور اور غیر متوازن اعصابی لوگ اگر اپنی جنسی خواہشات کو دبائیں تو ان کا جنسی سنڈ وذ — (PERVERSION) اور بڑھ جائے گا۔ اور طاقتور اس زہد کو اپنا کر مزید توانائی حاصل کریں گے۔ (ص ۱۴۴)

## ول ڈیورانٹ

اب امریکی فلسفی ول ڈیورانٹ کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ "یہ ایسا شخص ہے جسے تہذیب جدید کا دشمن نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ وہ مجموعی طور پر تہذیب جدید کے ارتقاء پر بڑا خوش نظر آتا ہے وہ مذہب کے بھی خلاف ہے اور اسلام کا تو خاص طور پر دشمن ہے۔ مکتبہ فرنکلین نے اس کی کتاب "نیرنگیٔ فلسفہ" کا ایک حصہ شائع کیا ہے "جامعۃ الدول العربیہ" نے اس کی کتاب "تہذیب کی کہانی" کے کچھ اجزاء کا عربی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ تہذیب جدید سے کس قدر مسرور اور کس قدر اسلام دشمن واقع ہوا ہے۔

اس کے باوجود وہ اپنی کتاب "نیرنگیٔ فلسفہ" میں تہذیب جدید کے بارے میں رقمطراز ہے۔

"ہماری موجودہ ثقافت سطحی اور ہماری معرفت خطرناک ہے۔ ہمارے پاس مشینوں کی کثرت اور مقاصد کا فقدان ہے۔ مذہبی جذبہ جو عقلی توازن پیدا کرتا تھا وہ بھی ختم ہوا اور سائنس نے اخلاق کی بنیادیں ہلا دیں۔ اب ساری دنیا ایک مضطرب انفرادیت میں بٹی ہوئی ہے جو دراصل اخلاقی گندگی کی عکاس ہے۔ ہمارے سامنے بھی آج وہی دشواری ہے جو سقراط کو پریشان کر چکی ہے یعنی ہم ایسے طبعی اخلاق کہاں سے لائیں جو ان آسمانی سرزنشوں کی جگہ لے سکیں جن کا اثر باطل ہو چکا ہے ہم اس فساد و جنون کا شکار ہو کر اپنی اجتماعی میراث کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ فلسفے کے بغیر اغراض میں وحدت پیدا کرنے والا اور خواہشات کو درست رکھنے والا کلی نظریہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے صلح کا راستہ چھوڑ کر اپنے آپ کو جنگ کی اجتماعی خودکشی میں مبتلا کر دیا ہمارے پاس سیاست داں لاکھوں ہیں۔ مگر صاحب بصیرت ایک بھی نہیں۔ ہم نے مثال سرعت کے ساتھ زمین کے گرد چکر تو لگا لیتے ہیں مگر ہمیں اپنی منزل کا پتہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ علم ہے کہ منزل پر پہنچ کر ہمارے مضطرب نفوس کو سکون میسر آئے گا یا نہیں؟ ہماری معرفت ہی ہماری تباہی کا پیش خیمہ بننے والی ہے کیونکہ

---

[1] یہ ایک سائنسدان کا قول ہے مگر ہمارے یہاں کے جاہل صحافی، جنسی افسانہ نویس اور سستے عریاں رسالے نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ راحت و سکون حاصل کرنے کے لئے خوب داد عیش دیں۔

ہم طاقت کے قبضہ میں بدمست ہو چکے ہیں اور بغیر حکمت کے اس سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔[1]

"مانع حمل ادویہ کی ایجاد اور ان کی کثرت اخلاق کی تباہی کا اصل سبب ہے۔ قدیم اخلاق جنسی ملاپ کو نکاح سے مقید رکھتا تھا۔ کیونکہ نکاح کا مطلب باپ بننا ہے اور اس میں نسل ممکن نہیں ہے اور بچہ کی ذمہ داری اسی وقت ڈالی جا سکتی ہے جبکہ وہ نکاح سے ہو، مگر آج کل جنسی ملاپ اور نسل کشی کا تعلق ختم ہو چکا ہے اور ایسا نکتۂ نظر ابھر آیا ہے جس کی ہمارے باپ دادا توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ مرد و زن کے تمام تعلقات اس سبب کی بناء پر متغیر ہو رہے ہیں۔ مستقبل کے اخلاقی قانون کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سہولتوں کو مد نظر رکھے جو خواہشات کی تکمیل کے لئے جدید ایجادات نے مہیا کی ہیں۔" (ص ۱۲۵۔ جلد ۱)۔

"جب کہ ہر شئے جنسی ملاپ کا باعث اور اس کا ہر راستہ سہل بن چکا ہے، موجودہ تمدنی زندگی نکاح کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہے۔ آج معاشی استقلال تاخیر سے ہوتا ہے۔ مگر جنسی نما جلد ہی ہو جاتا ہے۔ اگر زرعی اقتصادی نظام کے زیر سایہ جنسی خواہش کا دبائے رکھنا کوئی معقول کام ہو سکتا تھا تو وہ آج صنعتی تہذیب میں بہت دشوار اور غیر طبعی بن چکا ہے۔ چونکہ صنفی تہذیب نے مردوں کے نکاح کو تیس تیس سال تک مؤخر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسم میں ہیجان برپا ہو گا۔ ضبط نفس کی قدیم زمانے کی سی صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ عفت ایک مضحکہ خیز شئے بن چکی ہے، اور

---

[1] اس اعتراف کے باوجود کہ مذہبی جذبہ نے عقل میں توازن پیدا کر دیا تھا۔ اور موجودہ اضطراب آسمانی سرزنش سے علیحدگی کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود۔ ول ڈیورانٹ۔ اپنی کتاب میں جگہ جگہ مذہب پر، اور بالخصوص اسلام پر حملہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب کی جگہ فلسفہ لیلے۔ حالانکہ کوئی دور بھی فلسفہ سے خالی نہیں رہا۔ مگر معاشرہ میں توازن اور اخلاقی ترقی میں فلسفہ مذہب کے ہمسر نہ ہو سکا۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ول ڈیورانٹ مذہب کو اس وثنیت کے مشابہ قرار دے رہا ہے۔ جو سقراط سے پہلے تھی اور جو زوال پذیر ہو کر وہ شکل بن گئی تھی جس کا سقراط تذکرہ کر رہا ہے۔ مذاہب سماویہ اور یونانی وثنیت میں مشابہت بنانا ہوائے نفس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وہ حیا بھی نہیں رہی جو جمال میں اضافہ کرتی تھی۔ اب تو مرد اپنی لغزشوں پر فخر کرتے ہیں۔ عورتیں مردوں سے مساوات کا حق مانگ رہی ہیں۔ نکاح سے پہلے ملاپ ایک امر عادی بن چکا ہے۔ اب بدکاری کے اڈے پولیس کی نگرانی کی بناء پر نہیں بلکہ عورتوں کے مقابلے کی بناء پر سڑکوں سے غائب ہو گئے۔ غرض زرعی دور کا اخلاقی نظام پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ اور جدید دور اس پر عمل پیرا نہیں ہے۔[1] (ص ۱۲۶-۱۲۷)

ہم اس امر کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ازدواجی تاخیر کس قدر اجتماعی شر کا سبب بنتی ہے اس شر کا تھوڑا سا تعلق ہماری تعدد ازدواج کی خواہش سے بھی ہے جس کی ابھی تک اصلاح نہ ہو سکی اور طبیعت ہمیں ایک بیوی پر اکتفاء کے لئے آمادہ نہ کر سکی۔ اور اس برائی کا ایک حصہ ان شادی شدہ لوگوں سے متعلق ہے جو گھر کی چار دیواری میں محسوس ہونے والی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے نئی جنسی لذت کے خریدار بن جاتے ہیں۔ مگر دورِ جدید کی اکثر برائی، ازدواجی زندگی کی غیر طبعی تاخیر ہے۔ اور ازدواج کے بعد کی اباحیت دراصل تعدد ازدواج کی پرانی عادت کا نتیجہ ہے۔ کبھی ہم اس تابناک صنعتی تہذیب میں حیاتی اور اجتماعی علتیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی یہ سوچتے ہیں کہ اب یہ انسان کی خود پیدا کردہ دنیا ہے۔ اور اس سے کوئی راہِ فرار نہیں ہے[2] اور اکثر مفکرین کی یہی رائے ہے۔

البتہ یہ بات باعث شرم ہے کہ ہم ہنسی خوشی پانچ لاکھ امریکی لڑکیوں کو اباحیت کی قربان گاہ پر چڑھتا ہوا دیکھتے رہیں جو اباحیت کے سامنے کھیٹروں اور عریاں لٹریچر میں پیش کی جا رہی ہے۔

---

[2] دراصل راز یہی ہے کہ یہ دنیا انسان کی اپنی بنائی ہوئی ہے؛ جو اس نے اللہ سے اور اللہ کی ہدایت سے منحرف ہو کر بنائی ہے اور یہی تباہی کا سبب ہے۔

[1] ول ڈیورانٹ۔ ۱۰ لاکھ امریکی ہے مگر تاریخ کی مادی تعبیر کے مارکسی اصولوں کو اختیار کر رہا ہے۔ اصل میں مذہب بیزاری کے نتیجہ میں اسے یہ موقف اختیار کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ اعتراف کرنا نہیں چاہتا کہ لوگوں کی مذہب بیزاری نے انھیں اس انتشار کی میں مبتلا کیا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ یہ صرف زراعتی دور سے صنعتی دور میں آنے کا نتیجہ ہے۔

یہ اباحیت جو محروم مردوں اور عورتوں میں جنسی ہیجان پیدا کر کے دولت کما رہی ہے۔ حالانکہ لوگ بے چارے صنعتی تہذیب کی انارکی میں ازدواجی زندگی کے مفید تحفظ سے محروم ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی کم دردناک نہیں ہے۔ ہر وہ مرد جس کی شادی میں تاخیر ہو بازاری اور مبتذل لڑکیوں کے ساتھ لگ لیتا ہے اور اسے غیر شادی شدہ ہونے کے اس [illegible] میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے پورا مکمل نظام ملتا ہے جو باقاعدہ کسی سائنٹفک ادارے کی طرح منظم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا نے جذبات کو بھڑکانے اور پھر ان کی تسکین کے تمام ممکن طریقے دریافت کر لئے ہیں۔" (ص ۱۱۷ - ۱۲۸)۔

"لذت کوشی میں لوگوں کا ذوق تجدد ڈارون کے مذہبی معتقدات پر حملہ کرنے میں معاون بنا جب نوجوانوں کو دولت سے جرأت و ہمت مل گئی اور انھوں نے دیکھا کہ مذہب ان کی لذت کوشی کی مذمت کرتا ہے تو انھوں نے بھی مذہب کو بدنام کرنے کے لئے ہزاروں اسباب تلاش کر لئے جنسی زندگی میں سختی اور زہد کا ردعمل یہ ہوا کہ ادب اور نفسیات نے جنس کو زندگی کے مترادف قرار دیدیا۔ پہلے علماء الٰہیات اس پر بحث کرتے تھے کہ کسی لڑکی کے ہاتھ کو چھونا گناہ ہے یا نہیں؟ مگر اب ہم حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا یہ جرم نہیں ہے کہ ہم کسی لڑکی کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ کا بوسہ نہ لیں؟ لوگوں کا ایمان ختم ہو چکا ہے اور وہ پرانے خطرے سے بھاگ کر بے مقصد تجربہ کر رہے ہیں۔" (ص ۱۳۴)۔

"جنگ عالمگیر اول کا اس تغیر میں بڑا اثر ہے۔ کیونکہ اس جنگ سے صنعت اور تجارت کے زیر سایہ قائم ہونے والی سلامتی اور تعاون کی روایات ختم ہو گئیں۔ فوجی اباحیت اور وحشیت کے عادی ہو گئے۔ اور جب جنگ ختم ہوئی تو ہزاروں فساد کی جڑ بن کر واپس ہوئے۔ پھر اس جنگ میں قتل عام سے زندگی کی قیمت کم ہو گئی اور اضطراب نفسی کے شکار لوگ جرائم پیشہ ٹولیاں بنانے لگے۔ اللہ کی مہربانی پر ایمان ختم ہو گیا اور ضمیر سے مذہبی عقیدہ نکل گیا۔"[1]

---

[1] یہاں پر۔ ول ڈیورانٹ کو۔ اللہ کی مہربانی پر ایمان ختم ہونے اور ضمیر سے مذہبی عقیدہ کے نکل جانے کے نقصان کا اعتراف ہے۔ حالانکہ وہ تمام کتاب میں ان امور کو ہدف ملامت بناتا۔ اور ایمان بالغیب اور آسمانی تنبیہات کو عیب لگانے سے نہیں چوکتا۔

"معرکہ خیر و شر کے اختتام کے بعد فریب زدہ نسل آئی جس نے بے خیالی۔ انفرادیت اور اخلاقی اباحیت کے سپرد کر دیا۔ حکومتیں ایک طرف ہو گئیں اور قومیں دوسری طرف، طبقاتی کشمکش شروع ہو گئیں اور صنعتوں نے لوگوں کے فائدے سے صرف نظر کر کے نفع کو مقصود بنا لیا۔ مرد نکاح کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے اس سے کنارہ کش ہو گئے اور عورتیں باندیاں طفیلی بن کر رہ گئیں۔ نوجوانوں نے دیکھا کہ انھیں کچھ آزادیاں میسر آگئی ہیں اور ایجادات انھیں عورتوں کے ساتھ معاشقہ کے نتائج سے بچا رہی ہیں[1] اور اس کے چاروں طرف فن اور زندگی میں جنسی مؤثرات بکھرے ہوئے ہیں۔" (ص ۱۳۵-۱۳۶)

"کیونکہ آج کا دور مشینی دور ہے۔ اس لئے ہر چیز کو متغیر ہو جانا چاہیئے۔ ایک طرف اجتماعی امن میں اضافہ ہوا تو انفرادی امن ختم ہو گیا اور اگر جسمانی زندگی مامون ہو گئی ہے تو معاشی زندگی میں ہزاروں پیچیدگیاں موجود ہیں جس سے ہر وقت خطرہ ہے۔ نوجوان جن میں اقدام اور غرور پہلے سے زیادہ ہے تو وہ مادی لحاظ سے عاجز اور اقتصادی لحاظ سے اس قدر مجبور ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ محبت کا دور آتا ہے تو نوجوان شادی نہیں کر پاتے کیونکہ ان کی جیب قطعاً خالی ہوتی ہے۔ پھر کچھ سال گزرنے کے بعد محبت آستانۂ قلب میں داخل ہوتی ہے۔ مگر اتنا سرمایہ پھر بھی نہیں ہوتا کہ شادی کی جائے پھر جب محبت کا دور آتا ہے تو اس کی شدت کم ہو چکی ہوتی ہے تو اس نوجوان کے پاس سرمایہ ہوتا ہے مگر یہ شادی محبت کی موت ثابت ہوتی ہے۔

جب لڑکی شادی کے انتظار سے تھک جاتی ہے تو رکیک معاشقے لڑانا شروع کر دیتی ہے وہ عشق دلچسپیوں، جرائیوں کے بدلیوں اور شمپین کی محفلوں کے چکر میں پھنس جاتی ہے۔ اس کی حریت عمل دراصل اس کی حریت معیشت ہی کا ایک عکس ہے۔ وہ اپنی معاش میں مرد کا سہارا نہیں ڈھونڈتی اور مرد ایسی عورت سے شادی سے گریز کرتا ہے جو فنون محبت میں اسی کی طرح ماہر ہو گئی ہو۔ پھر عورت کی اچھی خاصی آمدنی امیدوار شوہر کو متردد کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی کم آمدنی میں

---

[1] ضبط تولید۔ اور پوشیدہ امراض کی جانب اشارہ ہے۔ جن کی فی زمانہ بڑی کثرت ہے۔

زندگی کے معیار کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

آخر کار رفیق سفر اس سے شادی پر آمادہ ہو جاتا ہے جو کلیسا میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ آزاد خیال ملحد نوجوان ہیں اور اخلاقی قانون کی ان کے دل میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ دونوں شہر کے کسی ہال میں (جہاں سے حکمرانوں کی خوشبو مہکتی ہے) شادی کرتے اور شہر کے چودھری کی جھاڑ پھونک سنتے ہیں۔

وہ کسی باعزت کلمہ سے مربوط ہونے کے بجائے مصلحتاً منسلک ہو جاتے ہیں اور جب چاہیں اس بندھن سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ نہ اس موقعہ پر کوئی خاص رسم ہوتی ہے۔ نہ کوئی رسم منگنی ہوتی ہے۔ اور نہ کوئی موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے۔ جذبات میں کوئی گہرائی اور ایسی خوشی نہیں ہوتی کہ وعدوں کے الفاظ ذہن سے کبھی نہ محو ہونے والی یادیں بن جائیں۔ پھر ان میں سے ایک اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو اور دونوں مسکراتے ہوئے مبارک باد کے شور میں اپنے گھر کو روانہ ہو جائیں۔

ان کے پاس کوئی گھر نہیں ہوتا جس میں ان کا انتظار ہو رہا ہو جو سرسبز گھاس اور ہرے بھرے درختوں کے درمیان ہو وہاں ایسے پھل پھول نہیں ہوتے جن کو وہ زیادہ خوش تماخیال کریں کیونکہ وہ ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دونوں شرمسار سے ایک کوٹھری میں چھپ جاتے ہیں جہاں وہ نہ زیادہ دیر رہ سکتے ہیں اور نہ اسے اپنے مزاج کے مطابق سجا سکتے ہیں۔ اس رہائش گاہ میں ویسا ہی سکون میسر نہیں آتا۔ جیسے آج سے بیس برس پہلے کسی گھر میں آیا کرتا تھا۔ (یہ کتاب ۱۹۲۹ء کی تصنیف ہے)۔ بلکہ صرف مادی تھے جس میں ہسپتالوں کی سی بے کیفی اور بد مزگی سی پھیلی رہتی ہے۔ کیونکہ یہ کوٹھری شور و شر کے درمیان لوہے اور پتھر کی عمارت میں ہوتی ہے جس میں بہار نہیں جا سکتی موسم سرما میں سرسبز کھیت نظر آنے کے بجائے پانی کا ریلا اندر آتا ہے۔ خزاں میں انھیں قوس و قزح یا درختوں پر کوئی رنگ نہیں نظر آتا۔ بس صرف پریشانیاں اور غمگین یادیں ان کے پاس رہ جاتی ہیں۔

عورت ناامیدیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ گھر کی چار دیواری میں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اور کچھ عرصہ بعد ہی اسے ہر موقع پر چھوڑ جاتی ہے اور صبح سے پہلے گھر

ٹوٹنے لگتی ہے۔ مرد بھی نا امیدیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب اس گھر میں رہنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے جس کی تعمیر اور اصلاح کا جذبہ اس کو وہ تکلیف محسوس نہیں ہوتے دیتا جو فی الحقیقت ہونی چاہئے!

کچھ دنوں بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کمرے ویسے ہی ہیں جیسے کمروں میں وہ غیر شادی شدہ رہا کرتا تھا اور اس کے بیوی سے تعلقات ویسے ہی ہیں جیسے پہلے اس کے تعلقات عام عورتوں سے ہوا کرتے تھے۔ اس گھر میں کوئی بات نئی نہیں ہے۔ کوئی اضافہ نہیں ہے۔ کسی شیر خوار کی آواز رات کی خاموشی نہیں چاک کرتی۔ اور نہ دن میں بچے خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ اور جب وہ کام سے واپس آتا ہے تو بیوی کے نرم بازو اس کا استقبال نہیں کرتے۔ اور نہ بیوی اس کی تکان دور کرنے کی فکر کرتی ہے۔ بچے کہاں کھیلیں گے؟ بچوں کے لئے علیحدہ جگہ کہاں سے میسر آئیگی؟ اور کس طرح سالوں تک انھیں شہر میں تعلیم دلائی جائیگی۔ اس لئے عقل مندی کا تقاضا ضبط تولید ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔

کیونکہ ان کی شادی صحیح معنی میں شادی نہیں ہوتی اور پدری تعلق کی بجائے صرف جنسی ملاپ ہوتی ہے۔ چونکہ ازدواجی زندگی کی بنیاد اور زندگی کو قوت پہنچانے والے اسباب ہی مفقود ہوتے ہیں اس لئے ازدواجی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ زن و شو ایک دوسرے سے کھچے کھچے سے رہنے لگتے ہیں اور دونوں میں اجنبیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ زندگی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ مرد کی تنوع پسند طبیعت از سر نو بیدار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اب اس کی بیوی میں اس کے لئے نیا پن باقی نہیں رہا ہے"۔
(ص ۲۲۳۔ ۲۲۵)۔

"کچھ لوگ ہمارے تجربات کے نتائج سے باخبر ہیں اور وہ ہمیں ایسی بات بتلاتے ہیں جس کی ہم توقع نہیں کرتے۔ ہم تو تغیرات کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں۔ اور یہ روش ہمیں ایسے انجام سے دو چار کر دے گی جس میں ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔ عادات، روایات اور تنظیموں کے اس طوفان میں کیا ہونے والا ہے۔ اب بڑے بڑے شہروں میں گھریلو زندگی ختم ہو چکی ہے کیونکہ یک زوجگی کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اب متعہ کی شادیاں زیادہ کامیاب ہوں گی۔ جہاں نسل مقصود نہ ہوگی اور آزادانہ اختلاط بڑھ جائے گا۔ اگرچہ مرد کو آزادی نسبتاً زیادہ ہوگی۔ مگر عورت اس شادی کو

اس عزلت پر ترجیح دے گی جس میں اس کا کوئی عاشق نہ ہو۔ ازدواجی زندگی کا معیار ختم ہو جائیگا اور عورت مرد کو شادی سے قبل تجربہ پر آمادہ کرے گی۔ طلاق بڑھ جائے گی۔ اور شہر مطلقہ عورتوں سے بھر جائیں گے۔ پھر شادی کا نظام از سر نو اور ذرا ہلکا پھلکا تشکیل دیا جائے گا۔ ضبط تولید ہر طبقہ میں عام ہو جائے گی اور عورت کے لئے حمل ایک عارضی شے بن جائے گا۔ بچوں کی تربیت کے لئے گھر کی جگہ سرکاری مراکز قائم ہو جائیں گے ۔ جی ہاں! یہ سب کچھ ہو گا۔[۱] (ص ۲۳۵ - ۲۳۶)۔

## سید ابوالاعلیٰ مودودی

اب اس تہذیب کے پہلوؤں اور انسانی زندگی اور انسانی خصوصیات پر مرتب ہونے والے اس تہذیب کے تباہ کن اثرات کے بارے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "پردہ" سے کچھ اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

" اٹھارویں صدی میں جن فلاسفہ اور علمائے طبیعین اور اہل ادب نے اصلاح کی آواز بلند کی تھی، ان کو دراصل ایک ایسے نظام تمدن سے سابقہ درپیش تھا جس میں طرح طرح کی جکڑ بندیاں تھیں جو کسی پہلو سے لوچ اور لچک نام کو نہ رکھتا تھا جو غیر معقول رواجوں، جامد قاعدوں اور عقل و فطرت کے خلاف صریح تناقضات سے لبریز تھا۔ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے انہیں اس کو ترقی کے ہر راستہ میں سنگ گراں بنا دیا تھا۔ ایک طرف نئی عقل اور علمی طبقہ متوسط (بورژوا طبقے) میں ابھرنے اور ذاتی جدوجہد سے آگے بڑھنے کا پرجوش جذبہ پیدا کر رہی تھی۔ اور دوسری طرف امراء اور پیشوایان مذہب کا طبقہ ان کے اوپر بیٹھا ہوا روایتی قیدکی گرہیں مضبوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ چرچ سے لے کر فوج اور عدالت کے محکموں تک شاہی محلوں سے لے کر کھیتوں اور مالی لین دین کی کوٹھیوں تک۔ زندگی کا ہر شعبہ اور اجتماعی تنظیمات کا ہر ادارہ اس طرح کام کر رہا تھا کہ محض پہلے سے قائم شدہ حقوق کے زور پر چند مخصوص طبقے ان نئے ابھرنے والے لوگوں کی محنتوں اور قابلیتوں کے ثمرات چھین لے جاتے تھے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر وہ کوشش جو اس صورت حال کی اصلاح

---

[۱] ملاحظہ فرمایئے۔ مصنف کی توقع کے مطابق یہ سب کچھ امریکہ میں ہو چکا ہے اور اب یہ سیلاب ہماری طرف آ رہا ہے۔

کے لئے کی جاتی تھی۔ برسر اقتدار طبقوں کی خود غرضی وجہالت کے مقابلہ میں ناکام ہوجاتی تھی ان وجوہ سے اصلاح وتغیر کا مطالبہ کرنے والوں میں روز بروز اندھا انقلابی جوش پیدا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ بالآخر اس پورے اجتماعی نظام اور اس کے ہر شعبے اور ہر جزء کے خلاف بغاوت کا جذبہ پھیل گیا اور شخصی آزادی کا ایک ایسا انتہاپسندانہ نظریہ لوگوں میں مقبول عام ہوا جس کا مقصد سوسائٹی کے مقابلہ میں فرد کو حریت تامہ اور اباحت مطلقہ عطا کر دینا تھا۔ کہا جانے لگا کہ فرد کو پوری خود مختاری کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہر وہ کام کرنے کا حق ہونا چاہیئے جو اس کو پسند آئے اور ہر اس کام سے باز رہنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے جو اس کو پسند نہ آئے سوسائٹی کو اس کی انفرادی آزادی چھین لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (ص ۴۷ - ۴۸)

اتفاق یہ کہ عین وقت پر دوسرے تمدنی اسباب بھی ساز گار ہوگئے۔ اسی زمانے میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) رونما ہوا اس سے معاشی زندگی میں جو تغیرات رونما ہوئے اور تمدنی زندگی پر ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ سب کے سب حالات کا رُخ اسی سمت پھیر دینے کے لئے تیار تھے۔ جدھر یہ انقلابی لٹریچر انھیں پھیرنا چاہتا تھا۔ شخصی آزادی کے جس تصور پر نظام سرمایہ داری کی تعمیر ہوئی تھی اس کو مشین کی ایجاد اور کثیر پیداواری (Mass Productions) کے امکانات نے غیر معمولی قوت بہم پہنچادی۔ سرمایہ دار طبقوں نے بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی ادارے قائم کئے۔ صنعت وتجارت کے نئے مرکز رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر بن گئے۔ دیہات ومضافات سے لاکھوں کروڑوں انسان کھنچ کھنچ کر ان شہروں میں جمع ہوتے چلے گئے۔ زندگی حد سے زیادہ گراں ہوگئی مکان، لباس، غذا اور تمام ضروریات زندگی پر آگ برسنے لگی۔ کچھ ترقی تمدن کے سبب سے اور کچھ سرمایہ داروں کی کوششوں سے بے شمار نئے اسباب عیش بھی زندگی کی ضروریات میں داخل ہوگئے۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کی تقسیم اس طرز پر نہیں کی کہ جن آسائشوں لذتوں اور آرائشوں کو اس نے زندگی کی ضروریات میں داخل کیا تھا۔ انھیں حاصل کرنے کے لئے وسائل بھی اسی پیمانہ پر سب لوگوں کو بہم پہنچاتا۔ اس نے تو عوام کو اتنے وسائل معیشت بھی بہم نہ پہنچائے کہ جن بڑے بڑے شہروں میں وہ

انھیں گھسیٹ لایا تھا۔ وہاں کم از کم زندگی کی حقیقی ضروریات۔ مکان۔ غذا۔ لباس وغیرہ۔ ہی ان کو بآسانی حاصل ہوسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر پر بیوی اور باپ پر اولاد تک بارِ گراں بن گئی۔ ہر شخص کے لئے خود اپنے آپ ہی کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ کجا کہ وہ دوسرے متعلقین کا بوجھ اٹھائے معاشی حالات نے مجبور کردیا کہ ہر فرد کمانے والا فرد بن جاتے۔ کنواری اور شادی شدہ اور بیوہ سب ہی قسم کی عورتوں کو رفتہ رفتہ کسب رزق کے لئے نکل آنا پڑا۔ پھر جب دونوں صنفوں میں ربط و اختلاط کے مواقع زیادہ بڑھے اور اس کے فطری نتائج ظاہر ہونے لگے تو اسی شخصی آزادی کے تصور اور اسی نئے فلسفۂ اخلاق نے آگے بڑھ کر باپوں اور بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں، شوہروں اور بیویوں سب کو اطمینان دلایا کہ کچھ گھبرانے کی بات نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے، خوب ہو رہا ہے۔ یہ گراوٹ نہیں اٹھان (Emanicipation) ہے۔ یہ بداخلاقی نہیں عین لطف زندگی ہے۔ یہ گڑھا جس میں سرمایہ دار تمہیں پھینک رہا ہے۔ دوزخ نہیں جنت ہے![1]

اور معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ حریت شخصی کے اس تصور پر جس نظام سرمایہ داری کی بنا اٹھائی گئی تھی اس نے فرد کو ہر ممکن طریقے سے دولت کمانے کا غیر مشروط اور غیر محدود اجازت نامہ دے دیا اور نئے فلسفہ اخلاق نے ہر اس طریقہ کو حلال و طیب ٹھہرایا جس سے دولت کمائی جاسکتی ہو۔ خواہ ایک شخص کی دولت مندی کتنے ہی اشخاص کی تباہی کا نتیجہ ہو۔ اس طرح تمدن کا سارا نظام ایسے طریقے پر بنا کہ جماعت کے مقابلے میں ہر پہلو سے فرد کی حمایت تھی۔ اور فرد کی خود غرضیوں کے مقابلے میں جماعت کے لئے تحفظ کی صورت نہ تھی۔ خود غرض افراد کے لئے سوسائٹی پر تاخت کرنے کے راستے کھل گئے۔ انھوں نے تمام انسانی کمزوریوں کو چن چن کر تاکا اور انھیں اپنی اغراض کے لئے استعمال (EXPLOIT) کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کرنے شروع کئے۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور وہ

---

[1] فاضل مصنف اپنی ناقدانہ بصیرت کے ساتھ اسلامی دنیا میں صحافتی، افسانہ نویسی اور دیگر راہ نمائی کے سازوسامان کی صورت حال بیان کر رہے ہیں۔ یہودیوں کا پروٹوکل کہتا ہے کہ "اقوام عالم کی تباہی کے یہی ذرائع ہیں جس کے بعد یہ اقوام یہودیت کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گی۔"

اپنی جیب بھرنے کے لئے لوگوں کو شراب نوشی کی لعنت میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے کوئی نہیں جو سوسائٹی کو اس طاعون کے چوہے سے بچائے۔ دوسرا اٹھتا ہے اور وہ سود خواری کا جال دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ کوئی نہیں جو اس جونک سے لوگوں کی خونِ حیات کی حفاظت کرے۔ بلکہ سارے قوانین اسی جونک کے مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں تاکہ کوئی اس سے ایک قطرۂ خون نہ بچا سکے۔ تیسرا اٹھتا ہے اور وہ قمار بازی کے عجیب طریقے رائج کرتا ہے حتیٰ کہ تجارت کے بھی کسی شعبہ کو قمار بازی کے عنصر سے خالی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہیں جو اس تپ محرقہ سے انسان کی حیات معاشی کا تحفظ کرے۔ انفرادی خودسری اور بجی و عدوان کے اس ناپاک دور میں غیر ممکن تھا کہ خود اغراض افراد کی نظر انسان کی اس بڑی اور شدید ترین کمزوری ـ شہوانیت ـ پر نہ پڑتی جس کو بھڑکا کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی کام لیا گیا اور اتنا کام لیا گیا جتنا کہ لینا ممکن تھا۔ تھیٹروں میں، رقص گاہوں میں اور فلم سازی کے مرکزوں میں سارے کاروبار کا مدار ہی اس پر قرار پایا کہ خوبصورت عورتوں کی خدمات حاصل کی جائیں ان کو زیادہ سے زیادہ برہنہ اور زیادہ سے زیادہ ہیجان انگیز صورت میں منظرِ عام پر پیش کیا جائے اور اس طرح لوگوں کی شہوانی پیاس کو زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے عورتوں کے کرائے پر چلانے کا انتظام کیا اور قحبہ گری کے پیشہ کو ترقی دے کر ایک نہایت منظم بین الاقوامی تجارت کی حد تک پہنچا دیا۔ کچھ اور لوگوں نے زینت اور آرائش کے عجیب عجیب سامان نکالے اور ان کو خوب پھیلایا تاکہ عورتوں کے پیدائشی جذبۂ حسن آرائی کو بڑھا کر دیوانگی تک پہنچا دیں اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹیں۔ کچھ اور لوگوں نے لباس کے نئے شہوت انگیز اور عریاں فیشن نکالے اور خوبصورت عورتوں کو اس لئے مقرر کیا کہ وہ انھیں پہن کر سوسائٹی میں پھریں تاکہ نوجوان مرد کثرت سے ان کی طرف راغب ہوں اور نوجوان لڑکیوں میں ان لباسوں کے پہننے کا شوق ہو اور اس طرح موجد لباس کی تجارت فروغ پائے۔ کچھ اور لوگوں نے برہنہ تصویروں اور فحش مضامین کی اشاعت کو روپیہ کھینچنے کا ذریعہ بنایا اور اس طرح عوام کو اخلاقی جذام میں مبتلا کر کے خود اپنی جیبیں بھرنی شروع

کردیں. رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشکل ہی سے تجارت کا کوئی شعبہ ایسا باقی رہ گیا جس میں شہوانیت کا عنصر شامل نہ ہو کسی تجارتی کاروبار کے اشتہار کو دیکھ لیجیئے عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر اس کی جزو لاینفک ہو گی گویا عورت کے بغیر اب کوئی اشتہار ہی نہیں ہو سکتا[1] ہوٹل ریسٹوران، شوروم کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں عورت اس غرض کے لیئے نہ رکھی گئی ہو کہ مرد اس کی طرف کھنچ کر آئیں. غریب سوسائٹی جس کا کوئی محافظ نہیں صرف ایک ہی ذریعہ سے اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتی تھی کہ خود اپنے اخلاقی تصورات سے ان حملوں کی مدافعت کرتی مگر نظامِ سرمایہ داری ایسی کچی بنیادوں پر نہیں اٹھا تھا کہ یوں اس کے حملے کو روکا جا سکتا. اس کے ساتھ ایک مکمل فلسفہ اور ایک زبردست شیطانی لشکر۔ لٹریچر۔ بھی تو تھا. جو ساتھ ساتھ اخلاقی نظریات کی شکست و ریخت بھی کرتا جا رہا تھا. قاتل کا کمال یہی ہے کہ جسے قتل کرنے جائے اسے بطوع و رغبت قتل ہونے کے لئے تیار کر دے"۔

یہ تو عورتوں کا حال ہے... ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت ھل من مزید کا تقاضا ہے کیونکہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے وہ حسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے. ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے تونس بن گئی ہے جیسے کسی کو لو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دیتا ہو. حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بیتاب ہو کر بے چارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں، یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبت کے افسانے، یہ عریاں اور حیزواں ناچ، یہ جذبات شہوانی سے بھرے ہوئے فلم آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے ۔ مگر دراصل بھڑکانے ۔ کے سامان ہیں جو اس غلط معاشرت نے ہر سینے میں لگا رکھی ہے اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے اس کا نام انہوں نے رکھا ہے: "آرٹ!"

---

[1] یہ تمام باتیں ہمیں اپنی صحافت میں بھی نظر آتی ہیں۔ اور مصنف نے سرمایہ دار دنیا کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ پوری طرح ہم پر بھی منطبق ہے. یہ روٹی کل یہی طریقہ کار رہتا ہے. اب اندازہ کیجیے کہ ہماری صحافت کس سرچشمہ سے سیراب ہو رہی ہے اور کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

یہ گھن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوت حیات کو کھا رہا ہے۔ یہ گھن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی۔ یہ ان تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کو کھا جاتا ہے جو قدرت نے انسان کو زندگی اور ترقی کے لیے عطا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہر طرف سے شہوانی محرکات میں گھرے ہوئے ہوں جن کے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح چھا گیا ہو جن کے خون کو عریاں تصویریں فحش لٹریچر، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق و محبت کے فلم، دل چھیننے والے زندہ مناظر اور صنف مقابل سے ہر وقت کی مڈبھیڑ کے مواقع پیہم ایک جوش کی حالت میں رکھتے ہوں۔ وہ کہاں سے، وہ امن، وہ سکون اور وہ اطمینان لا سکتے ہیں، جو تعمیری اور تخلیقی کاموں کے لئے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے ہیجانات کے درمیان ان کو اور خصوصاً ان کی جوان نسلوں کو وہ ٹھنڈی اور پرسکون فضا میسر ہی کہاں آسکتی ہے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کے نشو و نما کے لئے ناگزیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تو بہیمی خواہشات کا دیوان کو دبوچ لیتا ہے۔ اس کے چنگل میں پھنس کر وہ پنپ کیسے سکتے ہیں۔ (ص ۳۱-۳۲)۔

منع حمل کی تحریک کا اثر سب سے زیادہ فرانس پر ہوا تھا مسلسل چالیس سال سے فرانس کی شرح پیدائش گر رہی تھی۔ فرانس کے ستاسی اضلاع میں سے صرف بیس اضلاع ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی باقی ۶۷ اضلاع میں اموات کی شرح پیدائش کی شرح سے بڑھی ہوئی تھی بعض اقطاع ملک کا تو یہ حال تھا کہ وہاں ہر سو بچوں کی پیدائش کے مقابلے میں ۱۳۰-۱۴۰ اور ۱۶۰ تک اموات کی تعداد کا اوسط تھا۔ جنگ چھڑی تو عین اس وقت جبکہ فرانسیسی قوم کی موت اور زندگی کا سوال درپیش تھا۔ فرانسیسی قوم کے مدبروں کو معلوم ہوا کہ قوم کی گود میں لڑنے کے قابل نوجوان بہت ہی کم ہیں۔ اگر اس وقت ان قلیل التعداد جوانوں کو بھینٹ چڑھا کر قومی زندگی کو محفوظ کر بھی لیا گیا تو دشمن کے دوسرے حملہ میں بچ جانا محال ہوگا۔ اس احساس نے یکایک تمام فرانس میں شرح پیدائش بڑھانے کا جنون پیدا کر دیا! اور ہر طرف سے مصنفوں نے، اخبار نویسوں نے خطیبوں نے اور حد یہ کہ سنجیدہ ماہرین اور اہل سیاست تک نے ہم زبان ہو کر پکارنا شروع کیا کہ بچے جنو اور

جاؤ، نکاح کے رسمی قیود کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ ہر وہ کنواری لڑکی اور بیوہ جو وطن کے لئے اپنے رحم کو رضاکارانہ پیش کرتی ہے ملامت کی نہیں عزت کی مستحق ہے۔ اس زمانہ میں آزادی پسند حضرات کو شہ مل گئی اس لئے انہوں نے وقت کو سازگار دیکھ کر وہ سارے نظریات پھیلا دیئے۔ جو شیطان کی زنبیل میں بچے کھچے رہ گئے تھے۔" (ص ۵۶ - ۵۷)۔

شہوانیت کے اس تسلط کا اولین نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جارہی ہے۔ دائمی ہیجانات نے ان کے اعصاب کمزور کر دیئے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے اور امراض خبیثہ کی کثرت نے ان کی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس کے فوجی حکام کو مجبوراً ہر چند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لئے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تھرمامیٹر کی طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں[1]" (ص ۸۸)۔

" اس بے قید شہوانیت اور آوارہ منشی کے اس رواج عام نے دوسری عظیم الشان مصیبت جو فرانسیسی تمدن پر نازل کی ہے وہ خاندانی نظام کی تباہی ہے۔" (ص ۸۹)

" فرانس کی شرح پیدائش گزشتہ ساٹھ سال سے پیہم گرتی جارہی ہے۔ کسی سال شرح اموات شرح پیدائش سے بڑھ جاتی ہے کسی سال دونوں برابر رہتی ہیں اور کبھی شرح پیدائش شرح اموات کی بہ نسبت مشکل سے ایک فی ہزار زائد ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمین فرانس میں غیر قوموں کے مہاجرین کی تعداد روز افزوں ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی چار کروڑ اٹھارہ لاکھ نوے ہزار

---

[1] یہی حال امریکی نوجوانوں کا ہے۔ امریکی صدر نے کہا تھا کہ فوجی بھرتی کے لئے پیش ہونے والے نوجوانوں میں سے ہر چھٹا نوجوان ناکارہ نکلا۔ امریکی صدر نے اس صورت حال کو عیش پرستانہ زندگی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پوری امریکی قوم کی کمزوری کی طرف منسوب کیا۔

غیر قوموں کے لوگ تھے۔ یہ صورت حال یوں ہی جاری رہی تو بیسویں صدی کے اختتام تک فرانسیسی قوم عجب نہیں کہ خود اپنے وطن میں اقلیت بن کر رہ جائے۔" (ص ۹۶)۔

"یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ فرانس اس معاملہ میں منفرد ہے۔ فی الحقیقت آج ان تمام ممالک کی کم وبیش یہی کیفیت ہے جنہوں نے وہ اخلاقی نظریات اور معاشرت کے وہ غیر متوازن اصول اختیار کئے ہیں جن کا ذکر پچھلے ابواب میں کیا گیا ہے۔" (ص ۹۷)

کچھ عرصہ ہوا کہ ڈیٹرائٹ (DETROIT) کے اخبار فری پریس میں ان حالات پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی زیادتی اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی، ناجائز تعلقات کی کثرت یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی فطری خواہش مٹ رہی ہے پیدا شدہ بچوں سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ اور اس امر کا احساس رخصت ہو رہا ہے کہ خاندان اور گھر کی تعمیر تہذیب اور آزاد حکومت کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس کے برعکس تہذیب اور حکومت کے انجام سے ایک بے دردانہ بے اعتنائی پیدا ہو رہی ہے۔" (ص ۱۰۲)

"نفس پرستی ازدواجی ذمہ داریوں سے نفرت، خاندانی زندگی سے بیزاری اور ازدواجی زندگی کی ناپائیداری نے عورت کے اس فطری جذبۂ مادری کو قریب قریب فنا کر دیا ہے۔ جو نسوانی جذبات میں سب سے زیادہ اشرف واعلیٰ روحانی جذبہ ہے اور جس کی بقا پر نہ صرف تہذیب وتمدن بلکہ انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔ منع حمل، اسقاط حمل اور قتل اطفال اسی جذبہ کی موت سے پیدا ہوتے ہیں۔ منع حمل کی معلومات ہر قسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود ممالک متحدہ امریکہ میں ہر جوان لڑکی اور لڑکے کو حاصل ہیں۔ مانع حمل دوائیں اور آلات بھی آزادی کے ساتھ دکانوں پر فروخت ہوتے ہیں عام آزاد عورتیں تو درکنار مدرسوں اور کالجوں کی لڑکیاں بھی اس سامان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں تاکہ اگر ان کا دوست اتفاقاً اپنا سامان بھول آئے تو ایک پر لطف شام ضائع نہ ہونے پائے۔ ریج لنڈ سے لکھتا ہے:۔

ہائی اسکول کی کم عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنہوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف ۲۵ ایسی تھیں جنھیں حمل ٹھیر گیا تھا باقیوں میں سے بعض تو اتفاقاً بچ گئی تھیں لیکن اکثر کو منع حمل کی موثر تدابیر کا کافی علم تھا۔ یہ واقفیت ان میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔[1] (ص ۱۰۹ - ۱۱۰)

ایک امریکن رسالے میں ان اسباب کو جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے۔ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے۔ اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ فحش ہیں۔ فحش[1] لٹریچر جو جنگ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرت اشاعت میں بڑھتا چلا رہا ہے۔ متحرک[2] تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکاتی ہیں۔ بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ عورتوں[3] کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس اور بسا اوقات ان کی برہنگی اور سگریٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و امتیاز سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب اور معاشرت کا زوال اور آخر کار تباہی ہے۔ اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہو گی جن کو یہی نفس پرستی اور

---

[1] جج لنڈسے کا یہ تبصرہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ یہ حالت اب حقیت ہے اور ترقی ابھی رکی نہیں ہے۔ یہی کچھ ہماری صحافت بھی چاہتی ہے جس کو وہ پیغام خیال کر رہی ہے مگر یہ پیغام یہودیوں کے مفاد میں اور ان کے پروٹوکل کے مطابق ہے۔ انہی اخباروں میں کسی نے لکھا تھا کہ ترکی لشکر اس لیے ناکارہ ہو گیا تھا کہ یہودی لڑکیوں "ودنما" نے ان میں اباحیت پھیلا دی تھی صیہونیت نے ترکی لشکر کو جنگ کے سوا ہر شے کے قابل بنا دیا تھا اور نوجوان لڑکیوں سے آمادہ ترک روڈ پر معاشقہ لڑانا سکھا دیا تھا۔ یہی کچھ اخبارات ہماری اقوام میں کر رہے ہیں۔ اور یہ وہی کردار ہے جو ودنما نے ادا کیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں بے حیائی اور فساد پھیلانے سے کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟

شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے "

(ص ۱۰۲ تا ۱۰۳)۔

## عائشہ عبدالرحمن

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن "بنت الشاطی" "تیسری جنس کا ظہور" کے زیر عنوان اپنے دیا نا کے مشاہدات بتاتی ہیں:

" پرانے عربی کتب خانے میں مشقت سے پُر ایک ہفتہ گزارنے کے بعد میں ویانا کے نواحی میں رہنے والی اپنی دوست ڈاکٹر سے ملنے گئی۔ میرا خیال تھا کہ اتوار کا دن مناسب رہے گا۔ مگر جب میری دوست نے میرے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میری دوست کے ہاتھ میں آلو تھا اور وہ اسے چھیل رہی تھی پھر وہ مجھے اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے گئی اور وہاں ہم بیٹھ گئے۔ مگر چونکہ میری حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی اس لئے میری دوست کہنے لگی۔

" شاید تم اتوار کے دن ایک خاتون ڈاکٹر کو باورچی خانے میں دیکھ کر حیران ہو رہی ہو"

میں نے ہنس کر کہا: " خیر اتوار تو ٹھیک ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ تم اپنے پُر مشقت پیشہ کے باوجود باورچی خانے میں کیسے چلی آئیں"؟ اس نے جواب دیا۔

اگر تم اس کے برعکس کہتیں تو شاید ٹھیک ہوتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں اتوار کے دن مصروف رہنا تعجب کی بات ہے۔ اگرچہ مجھے اس جگہ آنے کی فرصت اتوار ہی کو میسر آتی ہے۔ رہ گیا باورچی خانہ۔ تو شاید یہ میرے پیشے سے تجاوز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس قلق و پریشانی کا ایک قسم کا علاج ہے جس سے میں اور میری جیسی پبلک امور میں مصروف خواتین دوچار ہیں:

جب میں نے پوچھا کہ اس پریشانی کی کیا وجہ ہے جبکہ مغربی عورت اجتماعی طور پر بڑی مستحکم ہے تو وہ کہنے لگی کہ اس پریشانی کا ان ذمہ داریوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو مشرقی خواتین کی جدید نسل پر ڈالی گئی ہے۔ بلکہ یہ پریشانی ایک آنے والے انقلاب کی صدائے بازگشت ہے جس انقلاب کی ماہرین اجتماع اور ماہرین حیاتیات و عضویات، کارکن عورت میں توقع کر رہے ہیں۔

اولاً۔ ان ماہرین نے عورت کے وجود میں واقع ہونے والے تدریجی تغیر پر کوئی خاص توجہ ہی

نہیں دی۔ صرف کارکن خواتین میں شرح پیدائش میں کمی کے اعداد وشمار سامنے تھے اور یہ خیال کیا گیا کہ شرح پیدائش کی یہ کمی اختیاری ہے۔ کیونکہ کارکن عورت اپنے کام کو جاری رکھنے کی خاطر، حمل وضع حمل اور رضاعت کی جھنجٹوں سے بچنا چاہتی ہے۔ مگر اعداد وشمار کے مطالعہ سے یہ بات منکشف ہوئی کہ کارکن عورتوں میں پیدائش کی کمی اکثر وبیشتر غیر اختیاری اور ناقابل علاج بانجھ پن ہے پھر جب اس بانجھ پن کے مختلف کیس سامنے آئے تو ان سے یہ علم ہوا کہ بانجھ پن کسی ظاہری عضوی عیب کی بنا پر نہیں ہے جس نے ماہرین کو یہ فرض پورا کرنے پر مجبور کر دیا کہ کارکن عورت کے مادی، ذہنی اور اعصابی طور پر مادری مشاغل سے لاپرواہ ہونے اور مردوں کی مساوات اور ان کے ساتھ شریک عمل رہنے کے نتیجہ میں اس کی اندرونی ساخت میں تبدیلی آرہی ہے۔

اپنے اس فرض کے لئے ماہرین نے مشہور قانون طبیعت سے استدلال کیا کہ "عمل اعضاء کی تخلیق کرتا ہے" جس کے معنی یہ ہوئے کہ وظیفہ مادری نے عورت میں خصوصیات مونث پیدا کی ہیں اب چونکہ عورت وظیفہ مادری سے دور ہوتی جارہی ہے اور مردوں کی دنیا میں گھس رہی ہے اس لئے اس کے اعضاء تانیث بھی مضمحل ہوتے جارہے ہیں۔

علماء نے ان خطوط پر اپنے تجربات کو آگے بڑھایا۔ اور کسی قدر اطمینان اور احتیاط کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ "تیسری جنس" ظہور میں آنے والی ہے۔ جس میں وہ تمام خصوصیات مندمل ہو جائیں گی جو وظیفہ نسوانی کی طویل ممارست کے بعد عورتوں میں پیدا ہوئی ہیں۔

اس پر کئی اعتراضات ہوئے پہلا اعتراض تو یہ اٹھایا گیا کہ اکثر عامل عورتیں بانجھ پن سے نفرت کرتی اور اولاد کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ جدید معاشرہ عامل ماں کے حقوق کا اعتراف اور ان کی حفاظت کرتا ہے اور قانون کے مطابق اسے مادری مشاغل اور فرائض کی ادائیگی کی سہولت دیتا ہے۔ اور تیسرا اعتراض یہ ہوا کہ عورت کو اپنی مخصوص دنیا سے نکلے ہوئے چند ہی نسلیں گزری ہیں جبکہ خصوصیات مونث کو جگ کے جگ کٹ گئے ہیں۔

پہلے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا کہ کارکن بیوی کی اولاد کی خواہش۔ اس کے نتیجہ میں پڑنے

والی ذمہ داریوں کے خوف تلے دبی رہتی ہے اور اسے یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ ذمہ داریاں اس کے کام میں حارج نہ ہوں۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں کہا گیا کہ کارکن ماں کے حقوق کا اعتراف بڑا محدود اور قانون کے شکنجے میں کسا ہوا ہے اور اکثر اصحاب عمل (بزنس مین) غیر ماؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب دیا گیا کہ اگرچہ عورت کو اپنی دنیا سے نکلے ہوئے مختصر عرصہ ہوا ہے مگر چونکہ اس عرصے میں مرد سے مساوات کا انتہائی جذبہ اور اس سے مشابہت کا حد درجہ اصرار اس میں موجود رہا ہے اور مساوات کی فکر اس کے اعصاب پر سوار، اور اس کے قلب وضمیر میں پیوست ہو گئی۔ اس لئے تغیر کے آثار جلد ہی رونما ہو گئے۔

بہرکیف اس موضوع کا مطالعہ کرنے والے عورت میں پیدا ہونے والے تغیرات پر غور کر رہے ہیں اور بڑی توجہ سے کارکن عورتوں میں بانجھ پن، دودھ کے خشک ہو جانے کی بنا پر دودھ پلانے سے معذوری اور وظیفۂ نسوانی سے مخصوص اعضاء کے اندمال کے بارے میں جمع ہونے والے اعداد وشمار کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ (الاہرام۔ روزنامہ)

## موسیٰ صبری

موسیٰ صبری اسٹاک ہوم سے اخبار الیوم کے ایک فیچر میں لکھتے ہیں۔

"مجھے ایک سویڈش یونیورسٹی کے استاذ نے بتایا کہ:

"ہم اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو کم عمری ہی میں جب وہ ثانوی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں انھیں واضح طور پر جنسی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے ہمارے یہاں کوئی جنسی مشکل نہیں ہے۔ لذت جنس بھی لذت طعام اور لذت خوش پوشی کی طرح ایک لذت ہے۔ مرد وزن میں شادی سے قبل ہی صنفی تعلق قائم ہو جانا، ایک عادی اور طبعی امر ہے اور جو شے نوجوان لڑکے کے لئے جائز ہو سکتی ہے وہ نوجوان لڑکیوں کے لئے بھی جائز ہو سکتی ہے"۔

مختصر یہ کہ سویڈن میں آزادی محبت کا مطلب یہ ہے کہ جنس کی پکار پیٹ اور عقل کی پکار کی طرح فطری ہے۔ اس لئے اسے دبا کر رکھنے اور چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب ان کے معاشرے میں مرد وزن کے صنفی مسئلہ میں یہ مجرد نظریہ رائج ہو چکا ہے۔ میں ایک چمکیلی صبح میں

"اسکانس" پارک میں تفریح کے لئے گیا تو وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ایک مشترکہ تالاب نہانے کے لئے بنا ہوا ہے اور آٹھ سے گیارہ سال عمر تک کے لڑکے اور لڑکیاں اس میں مادرزاد برہنہ نہا رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بڑے مرد و عورت بھی مکمل برہنگی کی حالت میں پانی میں اتر رہے ہیں اور ساحل پر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ اگرچہ موسم گرما میں اس طرح نہیں ہوتا بلکہ کچھ لوگ لباس غسل بھی پہن لیتے ہیں مگر پانی میں برہنہ ٹولی کا اتر جانا کوئی قابل توجہ امر نہیں ہے اور نہ یہ منظر دیکھ کر کوئی پیشانی شکن آلود ہوتی ہے۔

رہ گیا اس سوال کا جواب کہ اگر غیر شادی شدہ لڑکی ماں بن جائے تو کیا کرتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یا تو اسقاط کرا لیتی ہے۔ نہیں تو پیدائش سے لے کر سولہ سال کی عمر تک اس بچے کی پرورش تربیت اور تعلیم کی ذمہ دار حکومت ہے۔ رجسٹروں میں اس بچہ کا نام ماں کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اور اگر باپ اعتراف کرے تو اس کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ معاشرے میں حرامی بچوں اور غیر شادی شدہ ماؤں کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سویڈن دنیا کا ترقی یافتہ ملک ہے تو کیا اس سیلاب کی لپیٹ میں ہم اور دوسرے ممالک بھی آجائیں گے۔؟[1]

اعداد و شمار اور علمی تحقیقات سویڈن کو ایک ترقی یافتہ ملک بتاتی ہیں۔

ہر سویڈن کے شہری کے لئے قومی آمدنی میں سے ۵۲۱ گنی مصری سالانہ مخصوص ہے۔ یعنی ۴۳ گنی ماہانہ۔

سویڈن میں اشتراکی نظام نے طبقاتی فرق کو مٹا دیا ہے۔ کیونکہ وہاں تصعیدی ٹیکس (Pregressive Taxes) موجود ہیں اور ایسے صحی اور سوشل انشورنس ہیں۔ جن کا دوسرے ممالک میں وجود نہیں ہے۔

---

[1] "آجائیں گے" نہیں۔ آرہے ہیں۔ اور بڑی تیزی سے آرہے ہیں۔ کیونکہ تمام ممکنہ ذرائع ہماری قوم کا اخلاق تباہ کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔

ہر سویڈش شہری ان تمام مراعات کا مستحق ہے۔ معاش۔ بیماری میں مدد، عدم صلاحیت عمل کی صورت میں وظیفہ، مہنگائی الاؤنس، رہائشی سہولت۔ اور اندھے پن کی حالت میں وظیفہ۔

ہر شہری صحت کے انشورنس میں اپنے حصہ کا حقدار ہے۔ بیماری کی صورت میں اسے نقد مالی امداد ملتی ہے اور شفاخانوں میں مفت علاج ہوتا ہے۔

ہر عورت کو ماں بننے کے وقت امداد دی جاتی ہے اور یہ امداد ولادت طبی امداد اور نومولود کے وظیفہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

کام کے اوقات میں حادثات کا انشورنس لازمی ہے۔

بیکاری کے زمانے میں الاؤنس کی شرط تمام ترقی یافتہ ممالک میں نرم ترین ہے۔

حکومت بچوں کو یہ تمام ممکنہ مراعات دیتی ہے۔ سولہ سال کی عمر تک ہر بچہ کو ۴۰ گنی سالانہ مالی امداد دی جاتی ہے۔ علاج مفت ہے ۱۴ سال کی عمر تک بچوں کو چھٹیوں پر جانے کے اخراجات ملتے ہیں۔ اور ایسے نرسری اسکول ہیں جن کی فیسیں نہایت معمولی۔ اور جو کم عمر بچوں کی پرورش کا ذمہ لیتے ہیں۔

تعلیم تمام مرحلوں میں بالکل مفت ہے۔ ساتھ ہی لباس کے اخراجات اور قدرت نہ رکھنے والوں کو کھانے کا خرچہ ملتا ہے۔ طلباء کو تعلیمی قرضے دیئے جاتے ہیں۔ جو محنتی طلباء کو ۲۵۰ گنی تک مل جاتے ہیں۔

حکومت نئے شادی شدہ جوڑوں کو گھر بسانے کے لئے قرضے دیتی ہے جس کی رقم ۳۰۰ گنی تک ہوتی ہے اور یہ رقم معمولی سے سود کے ساتھ پانچ سال میں ادا کی جاتی ہے۔

سویڈش قوم جو ٹیکس ادا کرتی ہے حکومت اس کا ایک تہائی سوشل انشورنس میں خرچ کرتی ہے اور حکومت انشورنس کی رقم کا اسی فیصد نقد امداد کی صورت میں ادا کرتی ہے۔ سب سوشل امور کے محکمے کا بجٹ اہم ترین ہوتا ہے جو سال رواں میں ۳۳۴ ملین گنی تک پہنچ

گیا ہے۔ اس کے بعد وزارت تربیت کا بجٹ ۱۳۳ ملین گنی ہے۔ جب کہ قصر شاہی کا بجٹ ...۴۰ ہزار گنی ہے۔

زندگی کو مطمئن بنانے اور خاندان کی تشکیل کے لئے اس سارے تعاون کے باوجود سویڈش باشندوں کی تعداد کم ہو رہی ہے جب کہ حکومت نوجوان لڑکیوں کے شادی کے اخراجات اور بچوں کی یونیورسٹی تک تعلیم کی کفیل ہے۔ مگر اس کے باوجود سویڈن میں شرح پیدائش کم ہوتی جارہی ہے یہی نہیں بلکہ غیر شادی شدہ لوگوں کے مقابلہ میں شادی شدہ جوڑوں کی تعداد کم ہو رہی ہے اور حرامی بچوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے جبکہ تقریباً ۲۰ فیصد نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی ہی نہیں کرتے۔

سویڈن کا صنعتی دور ۱۸۷۰ء سے شروع ہوتا ہے اور اسی وقت وہاں سے اشتراکی سوسائٹی بھی پنپنے لگتی ہے۔ ۱۸۷۰ء میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد سات فی صد تھی جو ۱۹۲۰ء میں سولہ فیصد ہو گئی۔ اس کے بعد کے اعداد و شمار مجھے میسر نہیں آ سکے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ تعداد بڑھ رہی ہے

سویڈن میں طلاق کی نسبت دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ وزارت امور عامہ کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق وہاں ہر چھٹے یا ساتویں جوڑے میں طلاق ہو جاتی ہے۔ طلاق کی نسبت بھی نہایت کم تعداد سے شروع ہوئی مگر مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں ۱۰ ہزار میں ۲۶ طلاقیں ہوتیں۔ یہ تعداد ۲۶ سے بڑھ کر ۱۹۵۲ء میں ۱۰۴ اور ۱۹۵۴ء میں ۱۱۴ ہو گئی۔

۳۰ فیصد شادیاں حالات کے دباؤ کے ماتحت اس وقت ہوتی ہیں۔ جب لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ضرورتاً کی گئی شادی باقی رہنا مشکل ہے۔ طلاق پر آمادہ کرنے کے لئے سویڈش قانون بھی خاصا کچھ محرک ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر زن و شو طلاق کے خواہش مند ہیں۔ تو یہ کام بہت آسان ہے۔ اگر کوئی ایک طلاق کا مطالبہ کرے اور معمولی سے معمولی سبب بھی بتا دے تو بھی طلاق ہو جائے گی۔

سویڈن میں اگر آزادی محبت ہے تو ایک آزادی اور بھی ہے جس سے وہاں کے لوگ خوب

متمتع ہوتے ہیں۔ اور وہ ہے اللہ پر عدم ایمان کی آزادی۔ کلیسائی اقتدار سے آزادی کی تحریکات
پورے سوئیڈن پر چھائی ہوئی ہیں۔ بلکہ یہی صورت حال ناروے اور ڈنمارک میں بھی ہے۔ اساتذہ
اس آزادی کی نگہبانی کر رہے ہیں اور آنے والی نسلوں کی عقل میں آزادی کی خوبو رچا بسا رہے
ہیں۔ کلیسا ہر جگہ موجود ہیں مگر ان کی حیثیت عجائب خانوں سے زیادہ نہیں ہے۔ حکومت کلیسا کے
اخراجات برداشت کرتی اور پادریوں کو وظیفے دیتی ہے مگر کلیسا اتوار کے روز صرف چند گھنٹے کے
لئے کھلتے ہیں۔ اور بڑے بوڑھے۔ دادے پردادے ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ
ہے کہ انہوں نے بھی ہفتہ میں صرف تین گھنٹے کلیسا کے لئے متعین کئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ
چھٹی، جہاں تک اس فکر کا تعلق ہے کہ مذہب تمام انسانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ سو وہ
اس پر یقین نہیں رکھتے۔

مذہب پر عدم ایمان بھی سویڈن اور اسکینڈے نیویا کے ممالک کی نسل جدید کے لئے ایک
خطرہ ہے۔ کیونکہ عدم ایمان انھیں انحرافِ کی طرف لے جا رہا ہے۔ اور محذرات اور شراب کا رسیا
بنا رہا ہے۔

جن خاندانوں کے بچوں کے باپ پکے شرابی ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۷۵ ہزار ہے یعنی تمام خاندانوں
کے دس فیصد بچے شرابیوں کی اولاد ہیں۔ نوجوانوں کی شراب نوشی کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔ ۱۵ سے
۱۷ سال تک کی عمر کے جن نوجوانوں کو سویڈش پولیس نے نشہ کی حالت میں گرفتار کیا ہے۔ ان کی تعداد
اس تعداد سے تین گنا زیادہ ہے جو نشہ ہی کے سبب سے پولیس نے ۱۵ سالوں میں گرفتار کئے ہیں۔ نوجوان
لڑکوں اور لڑکیوں میں شراب نوشی کی عادت بد سے بدترین صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اور اس
کا نتیجہ بڑا ہولناک ہے۔ یعنی سویڈن میں جو لڑکے بالغ ہوتے ہیں ان کا دسواں حصہ عقلی اضطراب
اور جسمانی امراض کا شکار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عدم ایمان کی "آزادی" ان انحرافات میں
اضافہ کر رہی ہے۔ خاندانی بندھنوں کو ختم کر رہی ہے اور قوم کو نسل کے خاتمہ کی طرف لے جا رہی ہے۔
مجھ سے ناروے کے ایک صحافی نے کہا کہ اسکینڈے نیویا کے نوجوانوں کا مستقبل عدم ایمان کے

گڑھے میں گر رہا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی حکومت اس خطرے کے تدارک کے لئے کیا کر رہی ہے؟ اس نے متاسف لہجہ میں جواب دیا۔ "ہماری حکومت خود لادین ہے۔" (اخبار الیوم)۔

❖ ❖ ❖

ہم اس باب کو بغیر کسی تعلیق کے ختم کرتے ہیں اور اس باب میں دی گئی پرہول تنبیہات پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تنبیہات بذاتِ خود کافی ہیں۔ جو لوگ قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں وہ بلا سزا نہیں رہ سکتے اور فطرت کی سزا بڑی ہی ہولناک ہے۔ اگرچہ لوگوں کے لئے زمین اپنے خزانوں کا منہ کھول دے۔ زندگی کی تمام آسائشیں میسر آجائیں۔ قومی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ اور مادی ضمانتیں مل جائیں۔ مگر انسانی زندگی لگے بندھے فطری قوانین کے تابع ہے۔ اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔

ان قوانین فطرت کے بارے میں ڈاکٹر کیرل کہتا ہے۔

"لوگوں کو یہ احساس نہیں کہ ان کے جسم اور شعور قوانین طبیعت سے متصادم ہیں۔ قوانین طبیعت میں اغماض زیادہ ہے مگر سختی میں دنیاوی قوانین کی طرح ہیں اور لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں ہے کہ انھیں ان قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر سزا ضرور دی جائے گی۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان قوانین کی مخالفت سے ڈرایا ہے اور یہ مخالفت اس وقت ہوتی ہے جب لوگ اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم اور اس کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات سے روگردانی کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ضابطہ حیات کائنات میں اس کی سنت سے ہم آہنگ ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا سزا سے نہیں بچ سکتا۔

| | |
|---|---|
| فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا | پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی بھلا دیا۔ تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے |

أُوْتُوْا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُوْنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ٥

(الانعام ۴۴-۴۵)

یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انھیں عطا کی گئی تھیں۔ خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا۔ اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ

(یونس - ۲۴)

پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں۔ یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔

# "راہِ نجات کیا ہے؟"

اب آپ کے خیال میں اس صنعتی تہذیب کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیئے؟
تہذیب جدید کے ہولناک جرم اور اس کے انسانیت کے لیے خطرہ ہونے پر دلائل قائم ہو چکے ہیں جو کہ میں ترقی کی بام عروج پر پہنچ چکی ہیں وہ خود رو بہ زوال ہیں۔ اس تہذیب نے جو کچھ انسانیت کو دیا ہے وہ جنون عصبی اور نفسیاتی امراض شدو دا اور جرم ضعف عقل اور جسمانی عصبی اور نفسیاتی قوت برداشت کی کمی۔!

یہ ہے تہذیب جدید کے خلاف قائم کی گئی فرد جرم کا ایک حصہ!
تو کیا آپ کے خیال میں اس تہذیب کے "خاتمہ" کا حکم سنا دیا جائے جو اس کے جرائم کے عین مطابق ہے۔

ڈاکٹر کارل اپنی کتاب "انسان نامعلوم" میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب ان لوگوں کے لئے تصنیف کی ہے جن میں اتنی جرأت و ہمت ہے کہ وہ نہ صرف اس تہذیب میں عقلی سیاسی اور اجتماعی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کریں بلکہ صنعتی تہذیب کو بدل کر اس کی جگہ انسانی ترقی کی ضامن کسی نئی فکر کو جنم دیں۔

کارل کی فکر نو کو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ فی الوقت تو یہ بتانا ہے کہ تہذیب جدید کے لئے کالعدم قرار دینے کا فیصلہ مناسب نہیں ہے۔

ہم صنعتی تہذیب کے "اعدام" کا فیصلہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ یہ تہذیب اتفاقاً رونما نہیں ہو گئی بلکہ انسانی زندگی کی تاریخ میں اس کا ایک مقام ہے اور چونکہ یہ تہذیب ایک مخصوص تاریخی دور میں

انسان کی طبعی ضرورت کی تکمیل کے لئے ظہور پذیر ہوئی ہے اس لئے اس کی گہری جڑیں ہیں اور یہ تہذیب انسانیت کے خلاف جن ہولناک جرائم کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس تہذیب کے "خاتمہ" کا حکم دینا مناسب نہیں ہے!!

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ہم اس تہذیب کے اختتام کا فیصلہ نافذ کرسکتے ہیں۔ یا کچھ نئے تاتاری اس تہذیب کی عمارت ڈھا سکتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اس تہذیب کو اٹھا کر دریائے این، رائن، سین، ٹمبر اور پوٹومک میں پھینک سکتے ہیں یا جن احمق انسانوں کے پاس ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں۔ انھیں کسی وقت پاگل پن کا دورہ پڑ جائے اور وہ بیک لحظہ اس تہذیب کے سارے مراکز کو نشانہ بنا دیں۔

ان میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو۔ مگر ہمارے محدود انسانی فکر کے مطابق ۔ جو حقیقت خیر و شر سے ناواقف اور انجام سے ناآشنا ہے ۔ اس تہذیب کی تباہی انسانیت کے مفاد میں نہیں ہے اس نظریہ کے مطابق ہم انسانیت کے خلاف تہذیب جدید کے تمام جرائم کے باوجود اس کے بالکلیہ اعدام کا فیصلہ نامناسب خیال کرتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ پھر راہ نجات کیا ہے؟

## علم انسان میں اضافہ کی ضرورت

ڈاکٹر کاریل کے خیال میں راہ نجات یہ ہے کہ انسانی علوم میں اس قدر اضافہ ہو کہ انسان کی تخلیق نو ممکن ہو سکے وہ کہتا ہے کہ:

"ہر شے کا پیمانہ خود انسان کو ہونا چاہیئے۔ مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔ انسان بیچارہ خود اپنی پیدا کردہ دنیا میں اجنبی ہے۔ وہ اپنی دنیا کو از خود منظم نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسے اپنی طبیعت کی عملی معرفت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم حیات کے بالمقابل علوم جمادات میں انسان کی بے اندازہ ترقی خود اس کے لئے مصیبت بن گئی ہے۔ اب جو ماحول خود ہماری عقل اور ہماری ایجادات کا پیدا کردہ ہے۔ وہ ہمارے ڈھانچے اور قوام کے لئے نامناسب ہے ۔ ہم بڑے بدنصیب ہیں ۔ کیونکہ

ہم عقلی اور اخلاقی دیوالیہ پن سے دوچار ہیں۔ جو جماعتیں اور قومیں آج صنعتی تہذیب میں ترقی کی بام عروج پر پہنچ چکی ہیں یہی قومیں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ اور یہی اقوام سب سے پہلے بربریت اور وحشت کی جانب لوٹیں گی! مگر اب اس کا کوئی تدارک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ سائنس نے اس تہذیب کے گرد جس قسم کے بدترین حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ان سے بچانے والا کوئی نہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تمدن نے بھی گزشتہ تمام تمدنوں کی طرح زندگی کے ایسے معین حالات پیدا کر دیئے ہیں جو بذات خود زندگی کے ماحول کو محال بنا دیتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے اسباب کا ابھی تک علم نہیں ہوسکا۔ تہذیب جدید کے باشی جس اضطراب و بے چینی سے دوچار ہیں وہ ان کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظام کی پیداوار ہے۔ دراصل ہم لوگ علوم جمادات کے برخلاف علوم حیات کی پسماندگی کے بھینٹ چڑھ گئے۔

اس عظیم ترین برائی کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اپنے نفس کے بارے میں ایسی عمیق معرفت حاصل ہو کہ ہم اس ~~X~~ میکانکی عمل کو سمجھ سکیں۔ جس کے ذریعے موجودہ زندگی ہمارے وجدان اور ہمارے جسم پر نظر انداز ہو رہی ہے۔ اسی طریقے سے ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیں اور ہم حالات میں مناسب تبدیلیاں کرسکیں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اگر سائنس ہماری حقیقی طبیعت اور ہمارے ممکنات پر کچھ روشنی ڈال سکے اور یہ بتا سکے کہ ہم ان ممکنات کو کیونکر بروئے کار لاسکتے ہیں۔ تو ہمیں اپنے عضویاتی ضعف اور اپنے اخلاقی اور عملی امراض کا بھی کوئی سراغ مل سکے گا۔ اس کے سوا اپنے عضوی اور روحانی عمل کے قواعد کے معلوم کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اور نہ اس بات کا کہ ان میں سے کون امور درست اور کون سے نادرست ہیں اور اس بات کا ادراک کہ ہم اپنے ماحول اور اپنے نفس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق تبدیلیاں نہیں کرسکتے۔ کیونکہ تہذیب جدید نے زندگی کے طبعی احوال کو معطل کر دیا ہے اس لئے انسانی علم کی ضرورت زیادہ ہوگئی ہے۔" (ص ۴۳-۴۵)۔

٭ ٭ ٭

ہم اس سلسلے میں ڈاکٹر کاریل کی تائید کرتے ہیں کہ علوم انسان میں زیادتی ہونی چاہیے مگر ہم صرف اسی کو کافی خیال نہیں کرتے۔ نہ ہمیں علوم انسان میں اس قدر اعتماد ہے۔ جتنا کہ کاریل کو ہے اور نہ ہی ہم عضوی اور روحانی قواعد کی معرفت در ... نادرست کے عدم احساس اور اس احساس کی بنا پر کہ ہم اپنے ماحول اور نفس میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے ـــــ ناامیدی سے دوچار ہیں!

علوم انسان میں اضافہ یقیناً ضروری ہے۔ تاکہ کم از کم ہمیں یہ علم ہو سکے کہ انسان کے بارے میں کس قدر معرفت ہمارے اور سائنس کے بس میں ہے۔ اور ناگزیر جہالت کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ معرفت ہمارے لئے ضروری ہے تاکہ ہم اس کی روشنی میں یہ معلوم کر سکیں کہ ہم انسان کے بارے میں کس قسم کے تصرفات پر قادر ہیں۔ شاید پھر ہم ان حدود کی پابندی کر سکیں اور ان سے تجاوز نہ کریں اور نہ بلادلیل سرگرداں رہیں۔ جیسا کہ اب تک رہے ہیں۔

ڈاکٹر کاریل بتاتا ہے کہ علوم حیات کے علوم جماد سے مختلف رہ جانے کے طبعی اور غیر متغیر اسباب ہیں اور ان اسباب کا تعلق ایک طرف زندگی کی پیچیدگی اور دوسری طرف ہماری عقل کی طبیعت کی طرف ہے۔ اس لئے علوم حیات میں کبھی بھی وہ باریکی اور خوبصورتی پیدا نہیں ہو سکتی جو علوم جماد میں ہو چکی ہے۔

کاریل کے اپنے الفاظ ہیں:

"ہماری اپنے نفس کے بارے میں معرفت کبھی بھی اس تعبیری سادگی، تجرد اور جمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں تک مادی علم جا چکا ہے۔ کیونکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ عناصر ختم ہو جائیں جو انسانی علوم کی پیش قدمی میں رکاوٹ بنے ہیں۔" (ص ۲۳)

قابل تعجب ہے کہ یہ کہنے کے باوجود کاریل تہذیبی مشکل کے حل کرنے اور علوم انسان میں اضافہ سے انسان کی تشکیل نو پر اعتماد رکھتا ہے۔

## کاریل کی مجبوریاں!

اس تعجب کو دور کرنے کے لئے ہم خود کاریل کی مشکل کو سامنے لاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ہمیں حقیقی اور سہل اور واحد راہ نجات کے تعین میں آسانی ہوگی۔

کاریل، وسیع العلم، حسّاس، آزاد فکر اور مخلص ہے۔ وہ صنعتی تہذیب پر اس حد تک بر افروختہ ہے کہ وہ اس تہذیب کو بالکلیہ بدل کر اس کی جگہ انسانی ترقی کی ضامن فکر نو کی آمد کا خواہش مند ہے۔

مگر۔ ان خصوصیات کے باوجود — وہ بہرحال مغربی ہے۔ مغربی ماحول میں آگے بڑھا ہے وہ مغربی تاریخ کے قدیم اور جدید حالات میں جکڑا ہوا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسی مغربی تہذیب اور ماحول میں پروان چڑھا ہے جو تمام تر سائنس ہی کی منت کش احساں ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر کاریل تہذیب جدید کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اپنے ماحول، تاریخ اور واقعات زندگی کا اسیر ہے اور اس پر، اس ماحول کے عمیق اور سخت اثرات کندہ ہیں۔ اس لئے وہ کتنی ہی لمبی چھلانگ لگائے مگر اپنی تہذیب کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا!

اصل میں ڈاکٹر کاریل ایک ایسے ماحول میں سانس لیتا ہے جس کا دو صدیوں تک مطلقاً تجربی سائنس پر ایمان رہا۔ اگرچہ اب کسی قدر سائنسی فتوحات کے نشہ سے لوگ بیدار ہونا شروع ہوئے ہیں اور بہت سے امور میں اپنی جہالت کو محسوس بھی کر رہے ہیں۔ مگر دو صدیوں کے اثرات بہرحال گہرے اور سخت ہیں۔ اور ان اثرات کی گرفت ان لوگوں پر بھی مضبوط ہے جو سائنس کی حدود سے واقف ہیں۔

اس کے ساتھ ہی کاریل ایک ایسے ماحول میں رہا ہے جس میں مذہب کی خوبصورت ترین شکل یہ تھی کہ مذہب صاف شفاف روحانی تصوف تھا، اور اس کے ذریعہ بغیر کسی مادی واسطہ کے انسان کا غیب سے تعلق قائم ہو جاتا تھا۔ اس میں نمازیں اور مناجاتیں تھیں جن میں کھو کر انسان اپنی ذات سے غافل ہو جاتا اور ملاء اعلیٰ اس کا رشتہ قائم ہو جاتا۔

مذہب کی یہی روشن چمکدار شکل صوفی منش کاریل کو پسند ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی مذکورہ کتاب

اور اپنی کتاب "نماز" میں بیان کرتا ہے۔ اس کے خیال میں مذہب کی مذکورہ بالا شکل کو مناسب فضا میسر آنی چاہیئے۔ وہ مادی اور صنعتی تہذیب کے خلاف بغاوت اسی لئے کرتا ہے کہ وہ اس کا گلا گھونٹتی ہے اور اس کے ساتھ شعور جمال اور فنی روحانی اور مذہبی دلچسپی کو ختم کر دیتی ہے۔

سائنس پر یقین کامل اور مذہب کی اس مخصوص شکل سے کاریل۔ اور کاریل جیسے لوگوں کی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کی زندگی اور اس کی روح پر اس تہذیب کی نازل کردہ تباہی سے خوفزدہ ہیں۔ اور جن کا روحانی شوق ایک ایسی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جس میں روحانی عقیدہ کے لئے بھی کسی قدر گنجائش ہو۔

کاریل کی مشکل یہ ہے کہ وہ اس تہذیب سے باغی بھی ہے اور اس تہذیب کا اسیر بھی ہے۔ اس لئے اس کے خیال میں انسانی وجود میں اس تہذیب نے جو تباہی مچائی ہے اس کے روکنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

وہ زندگی کے صرف اسی منہاج سے واقف ہے جو سائنس نے متعین کیا ہے۔ مگر مذہب اپنی بہترین شکل میں بھی اس کی سوسائٹی میں صرف روحانی نشاط، اخلاقی تہذیب اور عالم بالا سے ربط وضبط کا ایک ذریعہ ہے۔

اور مذہب اپنی مذکورہ شکل میں انسان کے ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور صرف ایک پہلو پر انحصار خطرناک ہے۔ کیونکہ اس سے واقعی عملی اور مادی زندگی میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور اس میں اس امر کا شدید ترین خطرہ موجود ہے کہ تہذیب سے فرار ہو کر اس قسم کی روحانی دنیا کے اپنانے کا نتیجہ وہی رہبانیت ہوگا۔ جس کو یوروپ پہلے بھی بھگت چکا ہے۔ اور پھر جس کا رد عمل سخت ترین ملحدانہ مادیت پرستی کی شکل میں ہوا۔

اب اگر کاریل سوچتا ہے کہ زندگی کا ضابطۂ حیات مذہبی ہونا چاہیئے تو اس کے سامنے مذہب کی یہ ناپسندیدہ شکل آتی ہے۔ کیونکہ یوروپ اسی شکل سے واقف ہے۔ اس کے سامنے مذہب کی وہ شکل آتی ہے جو سرکش کلیسا نے لوگوں پر مسلط کر دی تھی۔ جس کے علم و زندگی کے بارے میں تمام تر

تصورات خرافات تھے! غرض یہ مذہب کی انتہائی ناگوار شکل ہے!

اس لئے اب بیچارے کاریل جیسے مخلصین کے لئے اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں کہ وہ صرف اور صرف سائنس کا سہارا لیں۔ اور ان امور میں بھی سائنس ہی کی جانب متوجہ ہوں جن کے بارے میں انہیں پوری طرح علم ہے کہ ان امور میں سائنس کے نتائج مادی دنیا کی طرح قطعی اور فیصلہ کن نہیں ہیں۔

مگر ان بے چاروں کے پاس ـ انسانیت کے لئے ـ سائنس کے سوا ہے ہی کیا؟

## اصل راہِ نجات ـ اسلام

مگر ہمارے پاس اسلام کا ضابطۂ حیات ہے ـ ہم ایک نسخۂ کیمیا کے مالک ہیں۔ جو روئے زمین پر کسی کے پاس نہیں ہے۔

ہم کاریل کو اس کی حیرت و پریشانی سے نجات دلا سکتے ہیں اور اس کی اس پر سے بھرپور پکار پر لبیک کہہ سکتے ہیں!

ہم اسلامی ضابطۂ حیات کے مالک جب ڈاکٹر کاریل کے موقف پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بے چارہ کاریل مہربانی اور افسوس کا مستحق معلوم ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ درحقیقت اس بارگران کو ہم ہی اٹھا سکتے ہیں اور ہم ہی انسانیت کو راہِ نجات دکھا سکتے ہیں۔

اسلام سائنس کا دشمن نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو علوم انسان کی جانب خاص توجہ کرتا ہے۔ مگر اسلام انسانی زندگی کی تعمیر کا کام سائنس اور علم کے سپرد نہیں کرتا۔ بلکہ علم اور عقل کے لئے دائرے بنا دیتا اور حدود متعین کر دیتا ہے جن حدود میں رہ کر انھیں کام کرنا ہوتا ہے۔

یہ حدود اس ذات کی متعین کردہ ہیں جو انسان کی حقیقت اور اس کی فطرت، اس کی قوتوں صلاحیتوں اور ضرورتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے سامنے انسان کی کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے ان گنت مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔

اللہ کی متعین کردہ یہ حدود بڑی وسیع اور مکمل ہیں۔ ان حدود میں رہتے ہوئے انسانی زندگی اپنے محور پر گردش کرتی رہے گی۔ اور اس کی اس گردش میں نشو و نما بھی ہو گا۔ اور وہ ہر خطرے سے مامون محفوظ بھی ہو گی۔

ہمارا اسلام صرف روحانی نشاط کا نام نہیں ہے۔ جس کے سوا کاریل کسی دوسری صورت سے واقف نہیں ہے۔ بلکہ اسلام تو ساری زندگی کو اپنی رزمگاہ بتاتا ہے۔ وہ زندگی کی ہر صورت اور ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسلام زندگی کی حدود متعین کر دیتا ہے جس میں وہ گردش کرتی اور اسلام کو اپنا محور بنائے رکھتی ہے عقل و سائنس صنعت و اقتصاد اور سیاست، نماز و دعا اور ملاء اعلیٰ سے ربط و ضبط غرض انسانی زندگی کے تمام پہلو اسی محور کے گرد اور انہی حدود کے پابند رہتے ہیں۔ اسلام مذہب کو ساری انسانی زندگی کا ضابطہ قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ ضابطہ اللہ تعالیٰ کا متعین کردہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی یہی ہے کہ اس قانون کے مطابق زندگی گزاری جائے۔

یہیں سے ہمیں۔ وہ راستہ نظر آتا ہے جس پر چل کر ہم نجات پا سکتے ہیں۔ اور یہ راستہ اپنے بعض مراحل میں کاریل کے طریقہ سے بھی بغیر کسی تعارض کے ہم آہنگ ہے۔

* * *

جس نقطہ سے ڈاکٹر کاریل اور دوسرے مغربی مخلصین ابتدا کرتے ہیں۔ ہمارا طریقہ کار اس نقطہ سے بہت پہلے والے نقطہ سے شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ کاریل جیسے اصحاب میں اخلاص کی کمی نہیں ہے۔ ان کے علم و معرفت میں بھی نقص نہیں ہے۔ اور انھیں اس امر کی بھی شدید آرزو ہے کہ وہ کسی طرح انسانیت کو گڑھے میں گرنے سے بچا لیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود یہ حضرات اپنے ماحول میں جکڑے ہوئے اور اپنی تہذیب کے اسیر ہیں۔ ان کا بڑے سے بڑا اقدام ایک اسیر پنچھی کے پر پھڑپھڑانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کسی ایسے منہاج تک نہیں پہنچ سکتے جس کے اپنے اصول علیحدہ ہوں۔ کیونکہ اس قسم کے کسی منہاج سے ان کا کوئی شعوری اور تاریخی ربط نہیں ہے

اگرچہ وہ علمی حیثیت سے واقف ہوں۔ اور کسی منہاج زندگی کے اختیار کرنے میں دارومدار تاریخی بندھنوں اور شعوری روابط پر ہوتا ہے۔

ہمارے طریقہ کار کی ابتدا اس نقطہ سے ہوتی ہے کہ اس کائنات میں انسان کا صحیح مقام متعین ہو اور یہ علم ہو کہ انسان کا کردار اور اس کے فرائض اور اس کے حقوق واجبات کیا ہیں؟

## اسلام کے بنیادی تصورات

☆ انسان نہ خود الٰہ ہے اور نہ دوسرے الٰہ سے اس کی کش مکش ہے۔ انسان ایسا حیوان بھی نہیں جسے اتفاقاً روئے زمین پر سیادت حاصل ہو گئی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ یہ سیادت بلی یا چوہے کو حاصل ہو جائے۔ انسان مشین بھی نہیں ہے کہ اس کی قدروقیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے کہ اس میں حرکت کی کتنی ہارس پاور طاقت ہے۔ انسان نہ مادے کا غلام ہے اور نہ اس کا سانچہ ہے کہ مادہ اس میں ڈھل ڈھل کر نکلتا رہے۔ انسان مشین کا بھی غلام نہیں ہے کہ اس کی زندگی اس کے افکار اور اس کے حالات مشین کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کوئی جانوروں کا گلہ بھی نہیں ہے کہ اس گلے میں اس کا اپنا کوئی امتیازی وجود اور ممتاز شخصیت نہ ہو۔

عورت شیطانی جال نہیں ہے اور صنفی ملاپ عمل شیطان اور گندگی نہیں ہے اور نہ ہی صنفی ملاپ کا مقصد لذت کوشی اور اس کا محرک ہوائے نفس ہے۔ مرد و زن۔ اپنے عمل اور کردار میں [illegible] اوی نہیں ہیں اور ان کی حیاتیاتی ساخت کا اختلاف بے مقصد و بے کار نہیں ہے۔ غرض انسان کے بارے میں جس تخبط و اضطراب کا تہذیب جدید شکار ہے ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔

☆ "انسان" ہر حال میں انسان ہے۔ اسے روئے زمین کی سیادت بھی حاصل ہے اور وہ اللہ کا بندہ بھی ہے۔ وہ اس زمین کا نگران ہے اور زمین کی تمام اشیا۔ اس کی تابع فرمان ہیں۔

انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ وہ تغیر و تبدل بھی کرتا ہے۔ بناتا اور سنوارتا بھی ہے اور اسے قدرت حاصل ہے کہ وہ روئے زمین کے خزانے اور طاقتیں اپنے کام میں لگائے۔ نوامیس کائنات بھی انسان کی مدد میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر انسان کا نفس حرم مقدس

اور اللہ کی حریم محترم ہے۔ انسان اس میں اللہ کے حکم کے بغیر دخل نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس کے بارے میں اللہ کی متعین کردہ منہج کے سوا کسی اور منہج پر چل سکتا ہے۔ انسان کو اس کے نفس کے بارے میں محدود معرفت دی گئی ہے اور اسے اس امر کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کے لئے کوئی منہاج یا قانون بنائے۔ اور نہ انسان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ہوائے نفس کو اپنا لے۔

"انسان" انسان ہے۔ حیوان نہیں ہے۔ انسان اس کائنات میں منفرد اور بامقصد مخلوق ہے اسے ایسی طبیعت عطا کی گئی ہے جو حیوان کی طبیعت سے جداگانہ ہے اور اسے ایسی خصوصیات عطا کی گئی ہیں جو حیوانی خصوصیات سے بالاتر ہیں۔ تاکہ انسان اس دنیا میں ایک مخصوص فریضہ ادا کر سکے۔ اس کے بلند مقصد تخلیق کی بناء پر خود اس کا مقام نہایت بلند ہے۔

انسان کی جس وقت تخلیق ہوئی اس وقت بھی وہ یہی کچھ تھا۔ اور آج بھی یہی ہے اور مستقبل میں بھی انسان یہی انسان رہے گا۔ اور جو لوگ اس حقیقت سے منحرف ہیں وہ ذلیل وخوار ہو کر اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

"انسان" انسان ہے مشین نہیں ہے اور نہ وہ مشین کا غلام ہے۔ وہ مادے اور مشینوں کی تخلیق نہیں ہے۔ انسان ایک انتہائی پیچیدہ مخلوق ہے۔ نہ وہ مادے کی طرح بسیط ہے اور نہ مشین کی طرح مجبور و بے کس! انسان کی تخلیقی تعقید اور پیچیدگی کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔ اگرچہ انسانی علوم کے بارے میں ہماری معلومات ابتدائی ہیں۔ اور علوم انسان میں وہ اضافہ ابھی نہیں ہو سکا ہے جس کا ڈاکٹر کاریل خواہاں ہے۔۔۔ مگر اس کے باوجود مادے کے بالمقابل زندگی اور انسان اپنی پوری تعقیدات کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔

سائنس پر یہ بہت بڑی زیادتی ہے کہ انسان کو مادی خیال کر کے اس کے ساتھ مادے کا سا برتاؤ کیا جائے۔ تاہم یہ خیال کریں کہ انسان مشین ہے اور اس کے ساتھ مشین جیسا برتاؤ کریں۔ اور سب سے بدترین بات یہ ہے کہ ہم مشین ۔۔ ذریعہ پیداوار ۔۔ کو الٰہ اقرار دیدیں کہ وہ جس طرح چاہے تغیر وتبدل کرے!!

"انسان" انسان ہے۔ حیوانی گلہ نہیں ہے۔ انسان کا ہر فرد دوسرے فرد سے ممتاز ہے اور ہر فرد اپنی بے نظیر انفرادیت اور حقیقی وحدانیت سے بہرہ ور ہے۔ اگرچہ تمام افراد عام انسانی خصائص میں باہم شریک ہیں۔ مگر ہر فرد کی کچھ اپنی ذاتی خصوصیات بھی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کا اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی نظام اور کارخانوں میں اس کے کام کا فنی طریقہ عام انسانی خصوصیات اور مخصوص انفرادی خصوصیات کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے۔ انسانوں کو کام میں حیوانی گلے کی طرح نہ جوتا جائے اور نہ فرد کو کارخانوں میں مشین کا بدل قرار دیدیا جائے۔

اگر انسان کی عام خصوصیات اور فرد کی ذاتی خصوصیات کا احترام کیا جائے تو مہندسین اور منتظمین کے لئے عمل کے ایسے فنی طریقوں کی دریافت کوئی مشکل نہ ہوگی جو ان خصوصیات کی حفاظت کریں۔ اور تکنالوجی میں بھی یہ امر ممکن ہوگا کہ پیداوار میں بھی اضافہ ہو۔ اور ان خصوصیات کا تحفظ بھی۔ اس طرح کسی عمل اور نظام میں نہ انسان پامال ہوگا۔ اور نہ فرد!!

"انسان" ـــ مرد و زن ایک ہی نفس سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر دو علیحدہ علیحدہ صنفیں ہیں اسلام دو صنفوں کو مدنظر رکھ کر نفسِ واحد کے دونوں حصوں کے ایک مشترک انسانی اصل سے متعلق تمام امور میں ایک ہی سے حقوق مقرر کرتا ہے۔ مگر اسی وقت ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ فرائض بھی بتاتا ہے۔ ایسے فرائض جو انسان کے وظیفۂ خاص اور دونوں کی قوتوں اور مجموعۂ تخلیق کے مطابق ہو۔ وہ بے چاری عورت پر یہ بوجھ نہیں لادتا کہ وہ حمل، رضاعت و تربیت کی مشقتیں بھی سہے۔ اور زندہ رہنے کے لئے عمل اور جد و جہد بھی کرے۔ جس طرح مرد کو اللہ تعالیٰ نے حمل وغیرہ کی جھنجھٹوں سے پاک کر دیا۔ اس کے بعد اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ عورت سے انصاف کرتا۔ اس کا احترام کرتا اور اس کی ترقی کا ضامن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عورت انسان سازی کا کام چھوڑ کر اشیاء کی صناعت میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں انسان کی قیمت اشیاء سے زیادہ ہے۔ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک ثقافت آشنا اور ماہر عورت اشیاء کی صنعت و پیداوار میں لگ جائے۔ وہ اپنی اولاد کی پرورش کے لئے ایک کمتر درجہ کی

عورت کو ملازم رکھ لے۔ تاکہ یہ عورت اس کے بچوں کی نگرانی کرے۔ اور یہ خود اشیاء کی نگرانی کرے۔

اسلام کے زیر سایہ اور سلسلہ کی بالکل ابتداء سے شروع کر کے انسانی علوم میں اضافہ کسی نہ کسی مرحلے میں اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ابتداء زیادہ سود مند نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

اسلام کی نظر میں صنعت اور صنعتی تہذیب بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔

اسلام نہ صنعتی تہذیب کو رد کرتا ہے، نہ اس سے اغماض برتتا ہے اور نہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ صنعتی تہذیب کی ابتداء تو خود اسلام کے تجربی علم سے ہوئی۔ یہ تجربی علم اندلس کی جامعات اور مشرق سے یورپ پہنچا۔ جیسا کہ بریولٹ، ڈوہرنگ اور گب وغیرہ۔ جو تاریخی حقائق کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

پھر یہ تجربی علم، کائنات، زندگی، انسان اور روئے زمین پر اسلام کے کردار سے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی بناء پر وجود میں آیا ہے۔ اور کائناتی واقعات میں اسلام کی غور و فکر کی دعوت نے اس تجربی علم کو وجود بخشا ہے۔

اسلام کا یہ نقطۂ نظر یونان کے تجریدی فلسفے سے مختلف ہے۔ جو یورپ کو وراثت میں ملا ہے۔

اسی طرح اسلام کا یہ نقطۂ نظر کلیسائی تصورات کے بھی برعکس ہے۔ کلیسا نے تو مادی علوم کو غیر متغیر اور مقدس تصورات قرار دیدیا تھا۔ مگر اسلام اس میدان میں انسانی عقل کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ انسانی عقل تحقیق و جستجو کرے، شواہد جمع کرے، مظاہر کی تلاش کرے، قوانین بنائے اور ان کو کام میں لانے کے وسائل تلاش کر کے انھیں عالم واقع میں مسخر کرے۔ پھر اس ساری کاوش میں جو کچھ بھی غلط و صواب ہو۔ اس پر کوئی جزا اور سزا نہیں ہے۔

اسلام صنعتی تہذیب کو رد نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ اس کے ان اسالیب کی پیداوار ہے جو

مسلمانوں کے واسطے سے یوروپ پہنچے۔ اور کلیسا نے ان کے خلاف سخت جنگ برپا کی جو بالآخر کلیسا اور کلیسائی مذہب کی شکست پر منتج ہوئی۔

## اسلام اور تہذیب جدید کا تعلق

علمی لحاظ سے تہذیب جدید کی عمارت جس بنیاد پر قائم ہے۔ وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ابتداء ہماری ہی شے ہے۔ اور اسلام اس تہذیبی پیداوار کو اپنی امانت خیال کرتا ہے جو اس کو واپس کردی گئی ہے۔ اسلام نے اس تہذیب کی تخلیق میں آج سے پانچ سو سال قبل بڑا اہم کردار انجام دیا تھا۔ اور اسلام میں اور اس کے مزاج میں بڑے وابستگی پائی جاتی تھی۔ کیونکہ اسلام یونانی طریقہ کے مطابق مجرد نظری فلسفہ کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اصلاً مثالی واقعیت، یا واقعی مثالیت کی جانب متوجہ ہے۔ تجربی سائنس کا یہی اولین محرک ہے جس کی بنیادیں نہ یوروپ میں ملتی ہیں۔ نہ یونانی اور رومی تہذیب میں اس کے آثار پائے جاتے ہیں اور نہ کلیسائی تصورات میں اس کا کوئی نام و نشان ہے۔

یہ کلیسائی تصورات تو مرکب ہیں۔ عیسائیت اور اس وثنیت کا جو کانسٹنٹائن اور دیگر رومی امراء اپنے ساتھ لائے۔ پھر اس آمیزے میں وہ سائنسی افکار بھی شامل ہو گئے جو اس زمانہ کے عوام میں رائج تھے۔ کلیسا نے ان تصورات کو اپنا لیا اور انھیں مقدس قرار دیدیا۔

اسلام اس تہذیب کی جس شے کو شدت سے رد کرتا ہے وہ تجربی سائنس کے علاوہ ہے۔

اسلام اس تہذیب کے اس مادی۔ (موضوعی اور حسی) مکتبۂ فکر کو رد کرتا ہے جو صرف مادی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی نظر میں کسی غیر مادی شے کا وجود بھی ناقابل تسلیم ہے۔ (اب یہ نظریہ بفضلہٖ تعالیٰ اپنی موت آپ مرچکا ہے)۔

یہ مادی مکتبۂ فکر انسان کو مادے کا تابع و محل بتاتا ہے۔ انسان کے جسم کی طرح اس کی عقل فکر اور تصورات بھی مادی اثرات قبول کرتے ہیں۔ اور انسان مادے کے سامنے ایک سلبی وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ (کانٹ۔ اور اس کے ساتھی) اور اس نقطۂ نظر کی رو سے تمام تاریخی

انقلابات میں انسانیت کی ایجابیت کا کوئی دخل نہیں رہتا۔ بلکہ وہ سب ذرائع پیداوار سے منسوب کردیئے جاتے ہیں۔ (کارل مارکس اور اس کے ساتھی)۔

اسلام انسان کے بارے میں ڈارون کے پیش کردہ نظریہ حیوان کو مسترد کرتا ہے اور فرائڈ کا انسانی محرکات کے بارے میں غلط نقطۂ نظر اور انسان کا صرف جنسی وجود قرار دینا بھی اسلام کو تسلیم نہیں ہے۔ جبکہ فرائڈ نے بیمار افراد کا مطالعہ کرکے ان کے حالات تمام انسانیت پر تھوپ دیئے۔

اسلام ان نظریات پر قائم ہونے والے تمام سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظاموں کو مسترد کرتا ہے۔ وہ ایسے ہر نظام عمل اور پیداوار کے تمام فنی طریقوں کو رد کرتا ہے جس میں انسان کی آمریت کو نقصان پہنچے۔ اس کی عام انسانی خصوصیات، اس کی انفرادی خصوصیات اور اس کی جنسی خصوصیات باطل ہوجائیں اور انسان مشین کا ایک پرزہ یا حیوانی گلہ کا ایک جانور بن جائے۔ تمام تر اہمیت صرف پیداوار کی زیادتی کو حاصل ہو۔ اور تہذیبی نظام میں انسان کے روحانی ذوق اور اس کی دیگر ضروریات کا قطعاً خیال نہیں ہے جس میں اس کے ذوق جمال اور فن اور اخلاقی اور مذہبی نشاط کی ضروریات بھی شامل ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر کاریل کہتا ہے)۔ مگر اسلام ان تنگ حدود میں محدود نہیں ہے جو کاریل کے ذہن میں ہیں۔ بلکہ اسلام ضابطۂ زندگی ہے ساری زندگی اس کی حدود میں حرکت کرتی اور اس کے تمام پہلو اسی دائرے میں نشوونما پاتے ہیں۔ خواہ انسانی زندگی کے یہ پہلو عملی پیداوار، سیاست و معیشت سے متعلق ہوں۔ یا اخلاق و عمل سے۔ ان کا تعلق نماز، دعا اور ملاء اعلیٰ سے ربط سے ہو، یا مشین و پیداوار سے۔!

اسلام پیداوار کے فنی طریقوں میں ترمیم کرکے، پیداوار میں اضافہ کی رغبت کو اور انسان کی عمومی خصوصیات اور فرد کی ذاتی خصوصیات سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی زندگی میں اعتدال پیدا کرکے زندگی میں استقرار اور توازن پیدا کرتا۔ اور انسان کی عمومی خصوصیات فرد کی ذاتی اور صنفی خصوصیات کو تحفظ دیتا ہے۔

❊ ❊ ❊

اسلام مادی تہذیب اور اس کے نو پیدا قوتوں کی فراہم کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ وہ طیبات دنیا سے مستفید ہونے اور مادی تہذیب کے پیش کردہ زمینی خزانوں سے فائدہ اٹھانے سے بھی نہیں روکتا۔ اسلام میں اس روحانی رہبانیت کا کوئی امکان امکان نہیں ہے جو یورپ میں کلیسا نے پیدا کی تھی۔ تاکہ اس رہبانیت کے ذریعہ رومی طرز زندگی کی لذت کوشیوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ یا زیادہ صحیح الفاظ میں زندگی کا سامنا ہونے سے گریز کیا جاسکے۔

اسلام طیبات دنیا سے مستفید ہونے سے نہیں روکتا۔ نہ وہ مادی تحقیقات اور ان تخلیقات سے فائدہ حاصل کرنے کے وسائل کو باطل قرار دیتا ہے بلکہ وہ تو ان تمام امور کو انسان کا فرض قرار دیتا ہے۔ خلافت کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان دنیا کے تمام معاملات کو درست کرے۔ اس کی بہتر اشیاء سے فائدہ اٹھائے۔ اس میں پوشیدہ خزائن کا پتہ لگائے اور طیبات دنیا سے مستفید ہو۔ مگر یہ سب کچھ اللہ کے مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے۔ اور اللہ کی عبادت اور شکر کے ساتھ ہو۔ اور اس امر کا احتیاط [illegible] اس کے نفس کی قوتوں اور زمین کے پوشیدہ خزانوں کو اس کا تابع بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے کہ اس نے انھیں زمین کی پیداوار اور زندگی کی گوناگوں سہولتیں عطا فرمائیں۔ پھر خوش خبری دیتا ہے کہ یہ تمام نعمتیں آئندہ بھی اسے میسر آتی رہیں گی پھر اللہ تعالیٰ نے جانوروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انسان کی آسائش، راحت ومنفعت اور خوبصورتی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ایسی اشیاء تخلیق کرتا رہتا ہے جن سے تم واقف بھی نہیں۔"

غرض تہذیب مادی کی پیدا کردہ ہر طیب و طاہر شے سے اسلام حلال طریقے پر استفادہ کرنے کو انسان کا حق قرار دیتا ہے۔

مگر اسلام اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ انسان زمین کی خیرات اور تہذیبی پیداوار سے

حیوان کی طرح فائدہ اٹھائے۔ اسلام انسان کو بندۂ شہوات بننے سے باز رکھتا ہے کہ شہوات اس کی قوتِ ارادی پر غالب آجائیں اور ایک مناسب حد پر رکنا اس کے بس میں نہ رہے۔ اور یہ افراط اسے کشاں کشاں ہلاکت و تباہی کی جانب لے جائے۔

اسلام لذت کوشی کو مقصدِ انسانیت تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ اس کا مقصدِ تخلیق اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ اور انسان اس وقت تک انسان نہیں بن سکتا جب تک اسے اپنے مقصدِ وجود کا علم نہ ہو۔ اور اسے اپنی شہوتوں اور لذتوں پر اتنی قدرت حاصل نہ ہو کہ وہ انھیں مناسب حدود پر روک سکے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ | اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں |
| وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ | اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے |
| وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد ۱۲) | ہیں۔ اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ |

اسلام کا اصل مقصد انسان کی انسانیت کا تحفظ ہے۔ کیونکہ انسان اپنا منفرد کردار اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب اس کا منفرد انسانی وجود برقرار رہے۔ اس لئے ہر وہ عامل جو اس کی طبیعت میں تغیّر کرنا چاہے یا اس کے خصائص کو تلف کرے، ایسا ہر عامل اسلام کی نظر میں مسترد ہے۔

اسلام ہی ہمارے عضویاتی اور روحانی اعمال کے قواعد کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ اور اس امر کا کہ کون سے امور درست اور غلط ہیں اسی سے ہمیں یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ ہم اپنے ماحول اور اپنے نفس میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اسلام ہمیں یہ تمام وضاحت سے بتاتا ہے۔ اسلام ہمیں اس انتظار پر مجبور نہیں کرتا کہ علوم انسان اس حد تک ترقی کر جائیں کہ اس خطرناک معاملے میں کہ جس پر انسان کی انسانیت اور انسانی معیار پر تہذیب کے بقاء کا دارومدار ہے۔ کوئی قطعی رائے دی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا رحم فرمایا ہے کہ بنیادی ضروریات کی تکمیل ہمارے علم و ارادے

پر موقوف نہیں رکھی بلکہ وہ بغیر ہمارے ارادے کے خود بخود انجام پاتی رہتی ہیں۔ جیسے کھانے کا ہضم ہونا۔ اور بقاء زندگانی کے لئے بدن کا غذا کو جذب کرنا۔ اسی طرح اسلام نے جائز و ناجائز امور کو ہماری جہالت پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ تمام کو بالتفصیل بیان کر دیا۔ طیبات کو حلال فرما دیا اور تھوڑی سی اشیاء کو ناجائز قرار دیدیا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ ہمارے لئے نقصان دہ ہیں خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ اور اسلام نے وہ حدود متعین فرما دیں جن میں رہ کر ہماری انسانیت اور انسانی خصوصیات کا تحفظ بھی ہو سکے اور ہم زندگی کی طیبات اور تہذیبی سہولتوں سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

٭ ٭ ٭

اسلام ان معاشی اداروں کو بھی مشکل نہیں خیال کرتا جن پر صنعتی تہذیب کی زندگی کے مسائل کی بنیاد ہے رہیں اس موضوع کی فقہی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا جس کے اسباب کی نشاندہی میں اگلے باب میں کروں گا۔)

مگر ظاہر ہے اسلام سودی بنیاد کو بالکلیہ مسترد کرتا ہے جبکہ بہت سے ادارے سود کی بنیاد پر قائم ہیں۔ اسلام اس گندگی کو اور اس جونک کو جو لاکھوں کا خون چوس رہی ہے نکال پھینکتا ہے اسلام کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کر سکتا جس میں دنیا بھر کے مزدوروں، صنعت کاروں، تاجروں مل مالکین، زمیندار، اور صاحب عمارات کی کد و کاوش کے تمام ثمرات صرف ان چند ہزار لوگوں کو پہنچ جائیں جو بڑے بڑے دولت گھروں اور قرض دینے والے بینکوں کے مؤسسین ہیں۔ انہی چند ہزار کے لئے ساری دنیا محنت کر رہی ہے اور ان کے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے سرمایہ کا نفع انھیں پہنچا رہی ہے۔ اور یہی لوگ سارے سرمایہ کو زیادہ منفعت بخش صنعتوں میں لگا رہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع کما سکیں۔ اور یہی وہ صنعتیں ہیں جو انسانی خصوصیات اور اخلاق کو تباہ کر رہی ہیں۔ یہی لوگ نظام سرمایہ داری کے مشہور "چکروں" کا سبب بنتے ہیں۔ انھی لوگوں کے ملعون جہنمی منصوبوں کی بناء پر "بیکاری" کے دور آتے ہیں جس کے نتیجے میں اخلاقی فساد پھیلتا ہے یہی

لوگ سامراجی منصوبے بناتے ہیں۔ چنانچہ ملکی سامراج کی ناکامی کے بعد معاشی سامراج نے اس کی جگہ لے لی۔ اور ایسے سینکڑوں عالمی مصائب کا سبب یہی سود خوار طبقہ ہے۔

اگر سودی نظام ہٹا دیا جائے تو یا تو یہ تمام مصائب بالکلیہ ختم ہو جائیں گے یا ان کی گرانباری کافی حد تک کم ہو جائے گی اور اگر سود کی لعنت ختم ہو جائے تو کسی قسم کے معاشی اداروں میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ (اس سلسلہ میں مفصل فقہی احکام کے بارے میں میرا نقطہ نظر محفوظ ہے)۔

موجودہ پیداواری طریقے، جن کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ کم سے کم مزدوری پر زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو جس سے بقول کاریل ملوں اور کارخانوں میں انسانی خصوصیات پامال ہو رہی ہیں۔۔۔ ان طریقوں میں ساری برائی سودی نظام کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ جو سرمایہ پیداوار میں لگایا جاتا ہے اس کا اکثر حصہ سودی قرضہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیدا کردہ حرص میں شدید ترین اضافہ ہو جاتا ہے اور سرمایہ دار چاہتا ہے کہ کسی طرح اتنا نفع حاصل ہو کہ قرضوں کا سود بھی نکل آئے اور مستقل نفع علیحدہ بچ رہے خواہ اس کے لئے کارکن اور مزدور کی انسانیت اور انسانی خصوصیات کو داؤ پر لگانا پڑے۔

پیداواری طریقوں میں تبدیلی تو ممکن نہیں ہے جب انسانی فکر نے سودی سرمایہ داری اور انسانیت کے لئے توہین آمیز مادیت کے زیر سایہ یہ طریقے دریافت کئے ہیں۔ وہی انسانی فکر دوسرے طریقے بھی اختیار کر سکتی ہے۔ جن میں ہمارے بیان کردہ دونوں مقاصد موجود ہوں۔ مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسانیت کے لئے توہین آمیز تصورات اور سودی منفعتوں کا سلسلہ بالکلیہ مٹ جائے۔

٭ ٭ ٭ ٭

صرف اسلام ہی وہ سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، اخلاقی، تعلیمی اور تربیتی نظام قائم کر سکتا ہے جس کے تحت انسان کی تشکیل نو ہو سکے جس انسان کو عصری زندگی اور اس کے موضوعی مقاصد نے کمزور بنا دیا ہے، اور جس تشکیل نو کے بارے میں ڈاکٹر کاریل کو امید ہے

کہ علوم انسانیت انجام دے سکتے ہیں۔

انسان کی تشکیل نو پر خود انسان قادر نہیں ہے۔ بلکہ جس ذات نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ وہی انسان کو نچلے درجے تک پہنچ جانے کے باوجود بھی بہترین شکل میں لا سکتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

(التین ۔ ۴ - ۶)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

جو کچھ کارل اور اس جیسے دیگر سائنسدان چاہتے ہیں۔ وہ انسان کی طاقت سے کہیں بلند ہے۔ یہ کام خداوند قدوس کے علم و قدرت میں ہے اور وہی اسے کر سکتا ہے۔ اور انسان الٰہی خصوصیات اپنانے سے عاجز ہے۔

انسانیت تیزی سے تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہی ہے۔ انسانیت خودکشی کر رہی ہے اور سائنس نے اس کے گرد و پیش میں حالات پیدا کر دیئے ہیں ۔ اس سے خود انسان کی زندگی محال ہو گئی ہے۔

جن خصوصیات کی بنا پر انسان انسان کہلایا اور جن کے بغیر خلافت کی بقا اور عناصر ارض پر سیادت ممکن نہیں ہے۔ ——— وہ خصوصیات انسانی بری طرح تباہ ہو چکی ہیں۔ مگر انسانیت کو شعور نہیں ہے۔

جو عقلاء اسے تباہی سے ڈرا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں اس تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ یا اگر پہنچ رہی ہیں تو انسانیت کو یہ قدرت حاصل نہیں رہی کہ وہ اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے کی طرف جانے سے بچا سکے ——— ایک ہی طریقہ ہے۔ جو انسانیت کو تباہی کے گڑھے میں جانے

سے روک سکتا ہے ـــــ یہی طریقہ راہ نجات ہے ـــ مگر یہ منہاج کس طرح انسانیت کے سامنے پیش کیا جائے ؟ اور کس طرح اس طریقہ پر چلا جائے ؟ ـــ اسی سوال کا جواب آخری باب میں دیا گیا ہے ۔

---

# "راہ نجات"

انسانیت کبھی بھی ایسے ضابطۂ زندگی کو تسلیم نہیں کرتی جو سنایا گیا ہو یا جسے صرف مطالعہ کیا جا سکے۔ انسانیت اس منہاج کو تسلیم کرتی ہے جو زندہ اور متحرک ہو۔ اپنی مجسم شکل میں انسانوں کی ایک جماعت میں عملاً جلوہ گر ہو۔ اسے آنکھیں دیکھ سکیں، اسے ہاتھ چھو سکیں۔ اور اس کے آثار عقل محسوس کر سکے۔

انسانیت اگر اسلامی منہاج زندگی کو اپنا سکتی ہے۔ تو وہ اسے ایک اسلامی معاشرے میں جلوہ گر دیکھ کر اپنا سکتی ہے۔

باوجودیکہ انسانیت عظیم ترین مصائب سے دوچار ایک وحشت انگیز بیابان میں بغیر کسی راہبر کے بھٹک رہی ہے۔

باوجودیکہ انسانیت ہولناک تجربات اور اذیت رساں بے راہ روی کا شکار گرتی پڑتی اور اپنے زخموں سے خون بہاتی زندگی کے راستہ پر کشاں کشاں چلی جا رہی ہے۔

باوجودیکہ مادی تہذیب کے زیر اثر انسانی خصوصیات تباہ ہو رہی ہیں۔ اور انسانی زندگی ہلاکت سے دوچار ہے۔ کیونکہ مادی تہذیب میں انسان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کی خصوصیات کی رعایت نہیں کی گئی ہے!

باوجودیکہ عقلاء محسوس کر رہے ہیں کہ انسانیت اور انسانی خصوصیات کس عظیم خطرے سے دوچار ہیں۔

ان سب حقائق کے باوجود انسانیت ایسے کسی ضابطۂ زندگی کو تسلیم نہیں کرتی جو سنا یا نہ ہو اور جسے صرف مطالعہ کیا جاسکے۔ انسانیت اس ضابطۂ زندگی کو تسلیم کرتی ہے۔ جو کسی معاشرے میں جلوہ گر ہو۔ وہ معاشرہ اس منہاج کی وجہ سے قائم ہوا اور یہ منہاج زندگی اس معاشرے کی فلاح کے لئے موجود ہو اور اس منہاج کی جملہ خصوصیات سوسائٹی میں اپنی پوری آب و تاب کی ساتھ موجود ہوں۔!

اسلام کے بارے میں ہزاروں تصنیفات، مسجدوں اور میدانوں میں سینکڑوں تقریریں دعوتِ اسلام کے لئے بنائی گئی متعدد فلمیں، اور ازہر وغیرہ سے بھیجے جانے والے لاتعداد وفود۔ یہ تمام کوششیں اور کاوشیں ایک ایسے چھوٹے سے معاشرے کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ جو دنیا کے کسی گوشے میں قائم ہو، جس میں اسلام کارفرما ہو، اور جو اسلام ہی کے لئے وجود میں آیا ہو جس میں اسلام کی جملہ خصوصیات جلوہ گر ہوں۔ اور جس میں اسلام زندگی کی عملی شکل میں جلوہ گر ہے۔!!

پوری دنیا میں بکھرے ہوئے اسلام دشمن صلیبی، سامراجی اور صیہونی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی لئے وہ اس امر کی اجازت دے سکتے ہیں کہ حدود میں رہتے ہوئے اسلام کے بارے میں کتابیں بھی تصنیف کرلی جائیں۔ اور تقریریں بھی کرلی جائیں اور شاذ و نادر اشاعت اسلام کے لیے فلمیں بنالی جائیں۔ اور ان کی نگرانی میں رہتے ہوئے اشاعت اسلام کے لئے وفود بھی روانہ کردیئے جائیں۔ مگر اپنے زبردست ظاہری اور خفیہ اقتدار کے بل بوتے پر اس امر کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتے کہ دنیا کے کسی گوشے میں کوئی چھوٹا سا اسلامی معاشرہ برپا ہو جائے۔ خواہ وہ سمندر سے گھرے ہوئے کسی جزیرے ہی میں کیوں نہ ہو!

کیونکہ انہیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام کے وجود کا یہی واحد اور مناسب ذریعہ ہے! یہ لوگ کافی عرصہ اسلام کے وجود سے پریشان رہ چکے ہیں۔ کیونکہ اسلام ان کے اسلامی دنیا اور اسلامی معاشرے کے سامراجی استحصال کے مقاصد میں رکاوٹ بنا ہوا تھا

جوں ہی انھیں اس حقیقت کا علم ہوا۔ انہوں نے اس زبردست رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اب وہ اسلام کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ کسی بھی قیمت پر اسلام عملی شکل میں موجود ہو!

☸ ☸ ☸

مگر ان باتوں کے باوجود اسلام ہی تباہ حال انسانیت کے لئے واحد راہ نجات ہے اس سخت ترین دور میں اسلام ہی فطرت کی پکار کا جواب ہے۔ کیونکہ خطرے کے وقت خواہ کتنی ہی بے ہوشی اور خمار کیوں نہ ہو، فطرت متنبہ ضرور کرتی ہے!

اسلام انسانی ضرورت اور فطری جبریت ہے۔ اس لئے اسلام کے ظہور کے اسباب تمام رکاوٹوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اسلام کے ظہور کے لئے اسباب پر فتون صیہونیت اور صلیبی سامراج سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اور مسلمانوں کی اسلام سے ناواقفیت، ان کی کم عقلی، اور ان کے سیل رواں میں بہ جانے سے بھی زیادہ طاقتور ہیں۔

اب اسلامی معاشرہ ضرور قائم ہو کر رہے گا۔ اگر اسلامی معاشرہ آج قائم نہیں ہوگا تو آئندہ ضرور ہوگا۔ اگر وہ یہاں برپا نہیں ہوتا تو کسی اور مقام پر برپا ہوگا۔ ہم زمان و مکان کی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم بہر حال انسان ہیں۔ ہمارے سارے اندازے غیب کے پردوں میں پنہاں ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی واقف نہیں ہے۔

☸ ☸ ☸

مندرجہ بالا کلمات سے غلط متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ لوگوں کے دلوں میں لمبی چوڑیں امیدیں پیدا ہونی چاہئیں!

چونکہ اسلامی معاشرہ کا قیام انسانیت کی بقاء کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اور چونکہ اسلامی معاشرہ اللہ کے مقرر کردہ ضابطہ حیات کی عملی شکل ہے۔ اس لئے اسلامی معاشرے کا ظہور ناگزیر تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ راستہ بڑا آسان ہے اور منزل چند قدم پر ہے!

بہر حال کسی شے، کا ناگزیر ہونا اس کے راستوں کی مشقتوں سے نجات نہیں دلاتا۔

اسلامی معاشرے کے قیام کا راستہ بہت ہی طویل انتہائی پر مشقت اور از حد پر خطر ہے۔ اس راستے کی سب سے دشوار بات یہ ہے کہ ہم اپنے تمام تصورات، افکار، اخلاق، اعمال۔ اور اپنے موجودہ تہذیبی اور مادی واقعہ کے ساتھ اسلام کے معیار تک بلند ہو جائیں۔

مگر بہر حال۔ اسلامی معاشرے کا قیام ایک انسانی ضرورت ہے۔ ایک فطری تبریت ہے۔ اسلامی معاشرہ کو برپا ضرور ہونا ہے۔ مگر اس راہ کی مشکلات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں!

٭ ٭ ٭

اسلامی معاشرے کے خطوط اور اس کی ذاتی خصوصیات کا علم ضروری ہے اور یہ کہ اس کا موجودٌ تہذیب اور اس کے قائم کردہ اداروں اور موسسات کے بارے میں نقطۂ نظر کیا ہوگا۔ اس کی معرفت بھی ضروری ہے۔

مگر ان امور کو کس وقت زیر بحث لایا جائے؟

اسلامی معاشرے کے خطوط اور اس کی ذاتی خصوصیات کے بارے میں عام معرفت تو اسی وقت سے ضروری ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کی طرف ہم نے اس کتاب کے ابواب میں اشارہ کیا ہے۔ اور میں نے اس سلسلے میں طویل اور مفصل بحثیں بھی کی ہیں۔ جو میری تصنیفات، "اسلامی معاشرہ کا قیام" اور "اسلامی تصور کی خصوصیات" میں موجود ہیں۔ اس موضوع میں یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کا تتمہ ہیں۔

رہ گئے یہ سوالات کہ اسلامی معاشرہ کا موجودہ زندگی سے کیا برتاؤ ہوگا؟ موجودہ حالات کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہوگا؟ اور موجودہ زندگی کے مسائل کس طرح فقہی قانون کے سانچے میں ڈھل سکیں گے؟ میرے خیال میں یہ مباحث قبل از وقت اور بے فائدہ ہیں!

آج انسانیت جس معاشرے میں زندگی گزار رہی ہے وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس معاشرے کے لوگ اسلام کو اپنا قانون زندگی اور ضابطۂ حیات تسلیم نہیں کرتے۔ ایسے جاہلی

معاشرے کے مسائل کے لئے اسلام کے شرعی اور فقہی قوانین وضع کرنا درست نہیں ہے۔ اور نہ اس قسم کے وضع کردہ قوانین سے روح اسلام اور اسلام کے واقعی منہاج کا کوئی واسطہ ہے۔

اسلامی فقہ صرف اسلامی معاشرہ میں نشو ونما پاتا اور ارتقاء کرتا ہے۔ اور ایک اسلامی معاشرے میں پیدا ہونے والی مشکلات کو سلجھاتا ہے۔ ایک ایسا اسلامی معاشرہ جو واقعی بالفعل موجود ہو۔ جو پیش پا افتادہ مشکلات کو اسلام کی روشنی میں حل کر رہا ہو، اور جس معاشرے کے لوگ اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہوں!

یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز کوشش ہو گی کہ ہم روس اور امریکہ میں پائے جانے والا اجتماعی اور معاشی حالات کے لئے اسلامی اور فقہی قوانین وضع کریں۔ کیونکہ روس اور امریکہ سرے سے اسلام کی حاکمیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے! یہی صورت حال ان دیگر ممالک کے لئے ہے جو اسلام کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتے!

ہر وہ فقہ جسے ایسے معاشرہ میں نشو ونما ارتقاء دیا جائے جو اسلام کی حاکمیت کو نہیں مانتا ایسا فقہ بے فائدہ اور عبث ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے!

تہذیب جدید کے بالمقابل اسلامی معاشرے کے مسائل، کسی دوسرے معاشرے کے مسائل سے مختلف ہوں گے۔ اور اسلامی معاشرے کے مسائل فی الوقت موجود نہیں ہیں کہ ان کے حل اسی وقت معلوم کئے جائیں۔ یہ مسائل تو جب کبھی اسلامی معاشرہ برپا ہو گا، اس وقت اپنی خاص شکل اور خاص وضع لئے ہوئے اور اس وقت کے حالات کے مطابق ہوں گے۔ اس لئے فرضی بنیادوں پر مسائل کے حل تلاش کرنا کارعبث ہے اور فقہا اسلام کے گروہ "ارائتیین"[1] کی خصوصیت ہے

اسی طرح تہذیب تبدیدکے بالمقابل جدید معاشرے کی مشکلات کسی اسلامی معاشرے کی مشکلات نہیں ہیں۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا۔ اور اسلامی دنیا میں

---

[1] فقہاء کا ایک گروہ جو فرضی مسائل کے فرضی حل بتایا کرتا تھا۔

غیر اسلامی قوانین نافذ العمل ہیں۔ اور اسلام نے یہ کام لینا قطعاً نامناسب ہے کہ وہ غیر اسلامی معاشروں کے لئے فقہی مسائل بتائے۔ ایسے معاشرے جن کی مشکلات پیدا ہی اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ وہ اسلام کو تسلیم نہیں کرتے یا اگر کبھی کرتے تھے تو اب چھوڑ دیا ہے۔ اسی لئے دور جدید کے مسائل کے لئے فقہی حل کی تلاش ایک کار عبث ہے۔

اسلامی معاشرے کے برپا ہونے میں یہ رکاوٹ نہیں ہے کہ ایک ارتقاء پذیر اسلامی فقہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اسلام کو بطور قانون زندگی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اسلامی فقہ کے ارتقاء کے لئے اس کا مناسب ماحول ناگزیر ہے۔ اور اس کا مناسب ماحول اسلامی معاشرہ ہے جو دور حاضر میں اس دور کے تہذیبی معیار پر رہتے ہوئے بالفعل موجود مسائل کا حل تلاش کرے۔ اور ان مسائل کے بارے میں اسلامی معاشرہ کا رویہ کسی اور معاشرے کے مماثل نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ بدیہی حقیقت اسلام کے مخلص "عقلاء" پر واضح نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرے کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کوئی خاص محدود اور معین تاریخی صورت نہیں ہے اور نہ دور جدید میں اس قسم کا محدود اسلامی معاشرہ برپا کرنا ہمارا مقصود ہے ہم جس معاشرہ کے درپے ہیں وہ موجودہ معاشرے کی تمام تہذیبی اور مادی پہلوؤں پر حاوی ہوگا اور ساتھ ہی اس میں اولین اسلامی معاشرے کی روح اور حقیقت بھی کارفرما ہوگی۔ اور یہ اولین معاشرہ اپنی روح، اپنی حقیقت، زندگی کے تصور، انسان کے مقصد وجود، کائنات میں انسان کے مقام اور انسان کی خصوصیات اور حقوق و واجبات میں بلند ترین نمونہ سمجھا جائے گا۔ مگر شکل و صورت، زمانے کے ارتقاء، نئی نئی ضروریات کے ظہور اور واقعی نشاط کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہے گی۔ حالات ہمہ وقت متغیر اور متحرک ہیں مگر ــ اسلامی معاشرے میں ــ ان کا تغیر اور ان کی حرکت اسلامی قانون کے دائرے میں رہ کر ہوتی ہے۔ اور اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ

ایک ہے۔ وہ اپنی صفات میں منفرد ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور حاکمیت اعلیٰ اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے قانون کی اطاعت کریں۔

ہم دراصل اسلامی معاشرہ برپا کرنے میں اسلامی فقہ کے پابند نہیں ہیں۔ اگرچہ ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس اسلامی معاشرے میں جس چیز کے پابند ہیں، وہ اسلامی قانون اسلامی منہاج اور اسلام کا عام تصور ہے۔

اسلامی معاشرے کے برپا کرنے میں پہلا کام یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت اللہ کے قانون کو ضابطہ حیات بنالے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسلام ہی کارفرما ہے، یعنی الوہیت اور ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کو ایک سمجھا جائے۔ جب انسانوں کا گروہ یہ سب کچھ کرلے گا۔ اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا۔ اور وجود میں آتے ہی زندگی کے مقابل وہ اپنے آپ کو، اپنے حالات اور اپنی حقیقی ضروریات اور ان ضروریات کے پورا کرنے والے وسائل کو اپنے عقیدہ اور عقیدت سے ابھرنے والے خاص تصورات کے تابع بنائے گا۔ اور وہ اپنے مقاصد اور مقاصد میں مدد دینے والے سے متاثر ہوگا ــــ واقعیاتی صورت کے مقابلے میں وہ اپنے مخصوص طریقہ کار کے تابع ہوگا۔ وہ بتائے گا کہ کون سے امور فطری ہیں اور حیات سلیمہ کے نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ اور کون سے امور غیر فطری اور نشوونما کے لئے نقصان دہ ہیں۔ ایسے تمام غیر فطری امور کو وہ نظر انداز کرتا چلا جائے گا۔ ان تمام حالات کے ساتھ زندگی کے بالمقابل درجہ بدرجہ اپنے خاص موقف کے لحاظ سے فقہی احکام ابھرتے جائیں گے۔

ہمارے خیال میں نیا اسلامی معاشرہ فقہ اسلامی کے نشوونما کا سلسلہ منقطع کر دے گا۔ کیونکہ یہ معاشرہ براہ راست اللہ کی اصل شریعت کی جانب متوجہ ہوگا اور فقہا کی آراء سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کیونکہ فقہا کی آراء ایک خاص دور اور خاص حالات کے لئے ہیں۔ اس لئے وہ نئے معاشرے پر منطبق نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ اصل مرجع و ماخذ اللہ کی شریعت ہی کو بنانا ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم فقہ اسلامی اور ائمہ کبار کی عظیم ترین خدمات کو نظر انداز کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ حالانکہ اصول قانون سازی اور بنیادی احکام میں فقہ اسلامی ان تمام کاوشوں سے بڑھ کر ہیں۔ جو تمام دنیا کے قانون دانوں نے پیش کی ہیں۔ بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ ابھرے گا تو وہ کیا طریقہ کار اختیار کرے گا۔ اور فقہی احکام کی وضع میں اس کا مزاج کیا ہوگا؟ فقہی احکام دراصل اسلامی معاشرے کی صورت حال کے بالمقابل ابھریں گے وہ معاشرہ جو اسلام کی حاکمیت کو تسلیم کرے گا!

اسلامی فقہ کا یہ عظیم ترین ذخیرہ اسلامی معاشرہ میں رفتہ رفتہ وجود میں آیا ہے اور یہ اسلامی معاشرہ زندگی کے مسائل کو اسلامی عقیدے اور اسلامی قانون کی روشنی بھی حاصل کر رہا تھا، اور اسلام کے سوا کسی دوسرے نظام کی حاکمیت کا معترف نہیں تھا۔ خواہ اس معاشرے میں عملی طور پر کہیں کہیں اسلام سے گریز کیا گیا ہو مگر عمل میں لغزش اور تطبیق میں انحراف اور شے ہے۔ اور سرے سے اسلامی قانون کی حاکمیت تسلیم نہ کرنا اور شے ہے۔ پہلی بات ایک اسلامی معاشرے میں رونما ہوتی ہے اور وہ اس کے باوجود بھی اسلامی معاشرہ رہتا ہے۔ اور اس میں اسلامی فقہ نشوونما پا سکتا ہے۔ اور دوسری بات صرف غیر اسلامی سوسائٹی میں رونما ہوتی ہے۔ یعنی ایسی سوسائٹی جس کا مزاج اسلامی فقہ کے نشوونما کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک جاہلی سوسائٹی ہوتی ہے اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خواہ وہ اسلامی ہی ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کرتی رہے!

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی فقہ، اسلامی شریعت سے علیحدہ نہیں ہے۔ اور اسلامی شریعت، عقیدۂ اسلامی سے جدا شے نہیں ہے۔ دراصل، اسلامی تصور میں فقہ، شریعت عقیدہ اور نظام زندگی ایک ہیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کی وحدت کے اجزاء علیحدہ علیحدہ کئے جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ اسلام ہو۔ اور مسلمان اور مسلم معاشرہ موجود نہ ہوا۔

اسلامی نظام کے علاوہ کسی بھی اجتماعی نظام میں اگر کسی شخص کو قانون سازی کے اصول اور طریقوں سے واقفیت حاصل ہو جائے تو وہ قانونی احکام وضع کر سکتا ہے۔

مگر اسلامی نظام میں صرف قانون سازی کے اصولوں سے واقفیت کافی نہیں ہے بلکہ دو امور کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ پوری قوم عقیدے اور نظام کو عملی زندگی میں برت رہی ہو۔

۲۔ قانون ساز بھی اپنی زندگی میں عقیدے اور نظام پر پوری طرح عمل پیرا ہو۔

اسلامی فقہ کے نشوو ارتقاء کی کوششوں میں یہ حقیقت مدنظر رہنی چاہیئے۔ اور اس کی مخالفت سے گریز کرنا چاہیئے۔ اسلامی دنیا میں جو ماہرین فقہ و قانون اسلامی فقہ کے نشوو ارتقاء کی کوششیں کر رہے ہیں تاکہ وہ جدید معاشرے کے حالات نظام مؤسسات اور ضروریات کے مطابق ہو سکے۔ میں ان ماہرین کا نہایت احترام کرتا ہوں، ان کے پرخلوص شوق و خواہش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور ان کی کوششوں کو اہم خیال کرتا ہوں۔ مگر میرے خیال میں ان کی یہ ساری کوششیں پادر ہوا ہیں۔ ورنہ بتایئے وہ اسلامی معاشرہ کہاں ہے جس کے لئے اسلامی فقہی احکام استنباط کئے جا رہے ہیں کہ یہ معاشرہ ان کی روشنی میں اپنے مسائل حل کر سکے۔؟

صرف اسلامی معاشرہ ہی اسلامی قانون کو اپنا ضابطۂ زندگی بناتا ہے۔ وہ ہی اپنی زندگی میں اسلام کو حکمراں سمجھتا ہے۔ اسی کی روشنی میں اپنی مشکلات کا حل نکالتا ہے۔ وہ ہی اسلامی احکام کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلے کے بعد اسے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

یہ اسلامی معاشرہ آج کہاں موجود ہے؟ روئے زمین کے کون سے گوشے میں ہے؟ آج غیر اسلامی معاشروں کے مسائل کے لئے جو فقہی احکام وضع کئے جا رہے ہیں وہ اسلامی معاشرے کے لئے مناسب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے میں سرے سے یہ

مسائل ہی نہیں ہوں گے یا اگر ہوتے تو ان کی شکل و صورت یہ نہیں ہوگی جواب ہے اور نہ معاشرہ کا ان مسائل میں اسلامی ہونے کی صورت میں وہ برتاؤ ہوگا جو غیر اسلامی ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سے عوامل اور بہت سے حالات مل کر اسلامی معاشرے کے مزاج اور اس کے طریقہ کار کو غیر اسلامی معاشروں کے مزاج اور طریقہ کار سے مختلف بنا دیں گے۔

میرے خیال میں یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔

حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، مالکؒ، ابوحنیفہؒ، احمد حنبلؒ، شافعیؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، قرافیؒ، شاطبیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیم جوزیہؒ، اور عز بن عبدالسلام وغیرہ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں فقہی احکام کا استنباط کیا۔ وہ

۱۔ ایسے اسلامی معاشرہ میں رہتے تھے۔ جس کے تمام معاملات میں اسلام ہی حکمران تھا جہاں اسلامی ضابطۂ زندگی نافذ تھا۔ (خواہ بعض ادوار میں اسلامی جزئیات کی مخالفت ہوتی رہی ہو۔) بہرکیف لوگ اسلام کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرتے۔ اور ان کے دلوں میں اس کے اثرات مرتسم تھے۔

۲۔ وہ اسلامی عقیدے اور قانون کو اپنی عملی زندگی میں بھی برتتے تھے۔ اور جس اسلامی معاشرہ میں رہتے تھے اس میں بھی اسی قانون پر چلتے تھے۔ وہ پیش آمدہ مسائل اور ان کے حل اسلام کی روشنی میں تلاش کیا کرتے تھے!

غرض یہ فقہا اسلامی فقہ کی نشوو ارتقاء کی دو بنیادی شرطوں میں پورے اترتے تھے۔ اور شروط اجتہاد بھی ان میں پوری ہوتی تھیں۔ جن کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔

مگر اب کیا ہے؟

ہم ایسے بہت سے عوامل شمار کر سکتے ہیں جو اسلامی فقہ کے نشوو ارتقاء کو اس کے اصل سرچشمہ سے دور کرنے کا باعث ہوئے۔

ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں۔ کہ عملی، نفسی، عقلی، شعوری اور اعتقادی صورت حال کس قدر

اسلامی فضا اور اسلامی زندگی سے دور ہو گئی ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ جن مسائل سے ہمارے معاشرے دوچار ہیں۔ وہ اسلامی معاشرے کے مسائل نہیں ہیں کہ ہم ان کے لئے اسلامی فقہی احکام کا استنباط کریں۔

ہمیں مغربی تہذیب اور واقعیاتی حالات کے سامنے اپنی عقلی اور روحانی شکست کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اسلام ہمیشہ واقعی صورت حال کے ساتھ تعامل کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ خود اس کے سامنے جھک جائے۔ تاکہ اس صورت حال کو اپنے تصورات، اپنے منہاج، اور اپنے احکام کے تابع بنائے۔ اور اس میں جو امور طبعی نشوونما کے لئے فطری اور ضروری ہیں انھیں باقی رکھے اور جو مفسد ہیں انھیں اکھاڑ پھینکے۔ خواہ وہ کتنے ہی عظیم الشان کیوں نہ ہوں۔ یہی کچھ اسلام نے اس وقت کیا تھا جب اس کا عرب جاہلیت سے تعامل تھا۔ اور یہی کچھ اسے ہر جاہلیت کے بالمقابل کرنا ہے۔

شکست کا سب سے بڑا پیش خیمہ یہ ہے کہ واقعی صورت حال کو اصل قرار دیدیا جائے اور شریعت اسلامی کو اس کے تابع بنادیا جائے۔ حالانکہ اسلام کہتا ہے کہ اللہ کا قانون اور اس کی شریعت اصل ہے۔ لوگوں کو اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور واقعی صورت حال میں اس کے مطابق تبدیلی کرنی چاہیئے۔ چنانچہ جب اسلام آیا اس نے جاہلی معاشرے کے ساتھ تعامل کیا اور اس میں تبدیلی کر کے اسے اپنے مخصوص طریقہ کار کے مطابق بنایا۔ اور اسے لیکر آگے بڑھا۔

اسلام کا موقف موجودہ دور کی عالمی جاہلیت کے بارے میں بھی وہی ہے جو جاہلیت اولی کے بارے میں تھا۔ اسلام اس معاشرے میں اپنے مزاج کے مطابق اصلاح کر کے اسے آگے لے کر بڑھے گا۔

ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے کہ جاہلی واقعیت کو اصل قرار دیا جائے یا۔ یا اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم کو اصل قرار دیا جائے۔

میں جدید معاشرے کی کسی مسئلے کے بارے میں اسلامی فتووں کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس

طرز عمل سے اسلام کا احترام متاثر ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی جج سے فیصلہ چاہیں اور اس کی تحقیر کے ساتھ اس کے فیصلہ کو بھی تسلیم نہ کریں۔ یا اگر آپ کی خواہش کے مطابق ہو تو مان لیں۔ ورنہ نہ مانیں۔ تو اس سے بڑھ کر کیا استہزاء ہو سکتا ہے۔

آج کل جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی بھی فرد نہیں ہے جس نے اسلامی نظام کو عملاً اپنایا ہوا ہو۔ اور اسلامی قانون کو اپنے معاشرے کا قانون تسلیم کیا ہوا ہو۔ کوئی بھی اللہ کے قانون کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا۔ کوئی بھی اللہ کو الوہیت میں منفرد نہیں خیال کرتا۔ اور نہ ہی کوئی فرد زندگی کے تمام معاملات میں اللہ اور اللہ کے قانون کو فیصلہ کن خیال کرتا ہے۔

جو لوگ۔ اچھی نیت سے یا بری نیت سے۔ اسلام سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ وہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ فتویٰ دیتے ہیں۔ اور موجودہ معاشرے کی کسی صورت حال کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فتویٰ پوچھنے والوں سے زیادہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر ان میں سے بہت سے لوگوں کو اسلام کی شان کا اندازہ ہو جائے تو وہ کبھی بھی اسلام کی شان میں یہ تمسخر گوارا نہ کریں۔

اسلام سے فتویٰ اس وقت لیا جا سکتا ہے جب اسلام ضابطہ زندگی ہو۔ اور یہ جب ہو سکتا ہے جب اسلامی معاشرہ قائم ہو۔ جس میں اسلامی قانون کے سوا اور کوئی قانون نافذ العمل نہ ہو۔

ہمیں اللہ کی رحمت پر یقین ہے کہ عنقریب اسلامی معاشرہ قائم ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کا قیام انسانی ضرورت، فطری جبریت اور فطرت کی پکار کا جواب ہے۔ اگرچہ اسلامی معاشرے کے ظہور کے یقینی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کام سہل الحصول ہے۔

❊ ❊ ❊

لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ موجودہ حالات تمام کے تمام اسلام کے مخالف ہیں تو اسلامی معاشرہ کیونکر برپا ہوگا۔

ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ یہ غور کریں کہ ظہور اسلام کیونکر اور کن حالات میں ہوا تھا۔ ایک شخص ساری انسانیت کے بالمقابل اللہ کے قانون کو لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ساری انسانیت جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اصل راستہ صرف اسلام کا راستہ ہے۔

یہ عظیم حقیقت شخص واحد کے دل میں اس طرح جاگزیں ہوگئی اور تاریخ کا رخ بدل گیا۔ اور اس طرح بدل گیا کہ دوست اور دشمن سب اس سے واقف ہیں۔

یہ حقیقت محمد رسول اللہ کے قلب میں جاگزیں ہوتا تھی۔ آج بھی ایک اٹل حقیقت ہے اور آج بھی گمراہ انسانیت جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

یہ حقیقت ابتداءً کسی شخص کے قلب میں اتر جاتی ہے۔ پھر کچھ اور لوگ اس حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ اور پھر مؤمنین کی ایک جماعت اس حقیقت سے روشناس ہوتی ہے اور قافلہ ایمان نہایت پر خطر اور طویل ترین راستے پر رواں دواں ہوجاتا ہے۔ یہ راستہ انسانیت کے لئے آج بھی ایسا ہی اجنبی ہے۔ جیسا اس وقت تھا جب محمد ہدایت لے کر آئے تھے۔ اور آخر کار قافلہ ایمان منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلا قافلہ منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کام آسان ہے۔ اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام اور جاہلیت کی کش مکش مختصر سی ہے ——— مگر میں یہ کہتا ہوں کہ فتح اسلام کی ہوگی۔ کیونکہ ہر حقیقت اور فطرت اسلام کی مؤید ہے۔ اور کائنات اور انسان کی طبیعت اسلام کا اقتضاء کر رہی ہے۔

---

اور اسلام کے بالمقابل بڑی مشکلات اور موجودہ دور کے تمام حالات ہیں۔ مگر یہ سب سمندر کے جھاگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے!

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

اللہ اپنا کام کرکے رہتا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

(یوسف ۲۱)۔

# سید قطب شہید۔ ایک تعارف

مصنف کا اصل نام سید ہے۔ قطب ان کا خاندانی نام ہے۔ ان کے آباؤ اجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ وہاں سے ہجرت کر کے بالائی مصر کے علاقے میں آکر آباد ہو گئے۔ انہی کی اولاد میں سے سید قطب کے والد بزرگوار حاجی ابراہیم قطب تھے۔

سید کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے سادہ اور محدود ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی والدہ محترمہ کی دلی آرزو کے مطابق بچپن میں قرآن حفظ کر لیا۔ اس زمانے میں مصر کے دین دار گھرانوں میں حفظِ قرآن کا عام رواج تھا۔ اور خاص طور پر جو خاندان اپنے بچوں کو ازہر کی تعلیم دلانے کا شوق رکھتے تھے انھیں لازماً بچوں کو قرآن حفظ کرانا پڑتا تھا۔ سید کے والدین اپنے اس ہونہار اور اقبال مند بچے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بڑے متفکر تھے چنانچہ قدرت کی طرف سے ایسا اتفاق ہوا کہ سید کے والدین گاؤں کو چھوڑ کر قاہرہ کی ایک نواحی بستی حلوان میں آ آباد ہوئے۔ اور یوں سید کے لئے اللہ تعالیٰ نے تعلیمی ترقی اور عروج کی راہ ہموار کر دی۔ سید قاہرہ کے ثانوی مدرسے "تجہیزیہ دار العلوم" میں داخل ہو گئے۔ اس مدرسہ میں ان طلبا کو داخل کیا جاتا تھا جو یہاں سے فارغ ہو کر "دار العلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں تکمیلِ تعلیم کرنا چاہتے تھے۔ اس دور میں جس طرح دینی و شرعی علوم کی اعلیٰ تعلیم گاہ ازہر یونیورسٹی تھی۔ اسی طرح دار العلوم جدید علوم و فنون کا اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ سید نے "تجہیزیہ دار العلوم" سے فراغت حاصل کرتے ہی ۱۹۲۹ء میں دار العلوم قاہرہ میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی۔ اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ اور اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اسی کالج میں پروفیسر لگا دیئے گئے۔

## سرکاری ملازمت اور سفر امریکہ

کچھ عرصہ تک دار العلوم قاہرہ میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے۔ پھر انھیں وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف اسکولز لگا دیا گیا۔ مصر میں یہ عہدہ بڑے اعزاز و افتخار کا منصب سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی دوران انھیں وزارت تعلیم کی طرف سے جدید طریقہ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔[1]

امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے مختلف کالجوں میں ہوا۔ واشنگٹن کے ولسن ٹیچرس کالج، گریلی کولوراڈو کے ٹیچرس کالج۔ اور کیلیفورنیا میں اسٹانفورڈ یونیورسٹی میں ان کا قیام رہا۔ دو سال کے بعد وہ امریکہ سے واپس لوٹے۔

## "اخوان المسلمون" میں شمولیت

امریکہ سے واپس آتے ہی انھوں نے "اخوان المسلمون" کی طرف توجہ دی۔ اس کی دعوت کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں وہ اخوان سے وابستہ ہو گئے۔[1] یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اخوان المسلمون کی تحریک نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ دوران جنگ انگریزوں نے آزادئ مصر کا جو وعدہ کیا تھا اخوان نے اُسے فوری طور پر پورا کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ اس سے ایک طرف اگر اخوان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا تو دوسری طرف انگریزی استعمار اور شاہی استبداد کی ملی بھگت سے ان کے لیے تکالیف و مصائب کے نئے دروازے بھی کھل گئے تھے۔ اخوان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سالوں کے اندر اندر ان کے صرف کارکنوں کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی، اور عام ارکان اور ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد اس سے بھی دو گنی تھی۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو "الشہید سید قطب" ص ۲۷ مقالہ یوسف العظم۔

[2] "الاخوان المسلمون والمجتمع المصری" تالیف محمد شوقی زکی ص ۲۱۔

۱۲ فروری ۱۹۴۹ء میں اخوان کے مرشد عام استاذ حسن البنا شہید کئے گئے، اور جماعت کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ آزمائش کا یہ مرحلہ مصر میں فوجی انقلاب کے قیام تک جاری رہا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جس نے بے شک اخوان المسلمون کی آزمائش کے ایک دور کو ختم کر دیا مگر ساتھ ہی آلام و مصائب کا ایک اور ایسا دور شروع کر دیا کہ بقولِ غالب ؎

دردکی دوا پائی درد لا دوا پایا

اس آزمائش کے بعد اخوان کے اندر جن لوگوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی اُن میں ایک حسن الہضیبی ہیں، جو بعد میں اخوان المسلمون کے مُرشد عام منتخب ہوئے اور دوسرے عبدالقادر عودہ شہید ہیں جو جماعت کے جنرل سکرٹری (وکیل) مقرر ہوئے۔ اور تیسرے جناب سید قطب جنھوں نے فکری میدان میں جماعت کی عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۵۱ء کے وسط میں اخوان المسلمون کی تحریک دوبارہ بحال ہوئی۔ فاروق کا دورِ جبر ختم ہوا۔ اخوان کے رہنما اور کارکن جیلوں سے رہا ہوئے، اور حسن الہضیبی کی قیادت میں قافلۂ تحریک نئے ولولوں سے دقفِ سفر ہوا۔ استاذ سید قطب اخوان کے مکتب الارشاد (مجلس عاملہ) کے رُکن منتخب ہوئے۔ جماعت کے مرکزی دفتر میں انھیں شعبۂ توسیعِ دعوت کا رئیس (انچارج) مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء سے پہلے تو وہ جماعت کے ایک عام رُکن تھے مگر اب ان کا شمار رہنماؤں میں ہونے لگا۔ اور انھوں نے اپنی زندگی ہمہ تن دعوت و جہاد کے لئے وقف کر دی۔ اور مختلف پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اس تحریک کی خدمت کی۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں مصر کے معاشرتی بہبود کے سرکل نے سید قطب کو معاشرتی بہبود کی کانفرنس میں شرکت کے لئے دمشق بھیجا۔ سید موصوف نے اس کانفرنس میں متعدد لیکچر دیئے جن میں قابلِ ذکر لیکچر یہ تھا: "التربیۃ الخلقیۃ کوسیلۃ لتحقیق التکافل الاجتماعی ـــ (اخلاقی تربیت اجتماعی کفالت کو بروئے کار لانے کا ایک ذریعہ ہے) کانفرنس سے فارغ

ہو کر سید موصوف اُردن کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ مگر اُردنی حکام نے انھیں سرحد پر روک لیا اور اُردن میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اُردنی حکام کا یہ اقدام گلب پاشا کے احکام کی بنا پر عمل میں آیا تھا جو ان دنوں اُردن کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں سید قطب کو اخوان کے مکتب الارشاد کی طرف سے بیت المقدس میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں بھیجا گیا۔ اس مرتبہ چونکہ سید قطب عالم اسلامی کے وفود کے ہمراہ اُردن میں داخل ہوئے تھے اس لئے اُردنی حکام کی طرف سے ان سے تعرض نہیں کیا گیا ورنہ سید قطب کی آتشیں تحریروں سے گلب پاشا کو جو چڑ تھی اُس کی بنا پر ان کا اردن میں قدم رکھنا آسان نہ تھا۔ جولائی ۱۹۵۴ء میں اخوان کی "مجلس دعوتِ اسلامی" نے سید قطب کو جریدۃ "اخوان المسلمون" کا رئیس التحریر مقرر کیا۔ موصوف نے صرف ۲ ماہ تک اس جریدے کی ایڈیٹری کے فرائض سر انجام دیئے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو یہ اخبار کرنل ناصر کی حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا، کیونکہ اس اخبار نے اخوان المسلمون کی پالیسی کے تحت اُس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی جو ۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا۔ اس پیکٹ کے بعد اخوان اور ناصر کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ اور اخوان شدید تر دورِ ابتلاء میں گھر گئے۔ ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومتِ مصر نے اخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اخوان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ انھیں موت کی سزائیں دی گئیں [۱] ان کے ہزارہا کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا اور ایسا محشر خیز ہنگامہ برپا ہوا کہ ہر اُس شخص کی عزت و آبرو اور جان و مال پر دست درازی کی گئی جو اخوان کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتا تھا۔[۲]

---

[۱] جن لوگوں کو موت کی سزائیں دی گئیں (۷ر نومبر ۱۹۵۴ء) ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:
(۱) عبد القادر عودہ (۲) محمد فرغلی (۳) یوسف طلعت (۴) ابراہیم الطیب (۵) ہنداوی دویر (۶) محمود عبداللطیف

[۲] مصر کے نامور اخبار المصری کے ایڈیٹر احمد ابوالفتح کا بیان ہے کہ چند ہفتوں کے اندر اندر گرفتار شدگان کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ ملاحظہ ہو کتاب "جمال عبدالناصر" تالیف احمد ابوالفتح ص ۲۰۵۔

## رہائی!!

سنہ ۱۹۶۴ء کے وسط تک سید قطب مصر کے مختلف جیل خانوں میں رہے۔ ابتداء کے ۳ سال تو انھوں نے انتہائی اذیت اور عذاب میں گزارے۔ مگر بعد میں جبر و تشدد کا سلسلہ ہلکا کر دیا گیا۔ اور ان کے اعزہ و اقارب کو بھی ملاقات کی اجازت مل گئی۔ اور خود انھیں بھی جیل کے اندر اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کی سہولت کسی حد تک مہیا ہو گئی۔ اس جزوی سہولت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" کی تکمیل پر متوجہ ہو گئے ۱۹۶۴ء کے وسط میں جب کہ ان کی قید کو تقریباً دس سال ہو گئے تھے اور بالعموم ۱۵ سال کی سزا پانے والا قیدی عملاً دس یا گیارہ سال گزار کر رہا ہو جاتا ہے، عراق کے مرحوم صدر عبدالسلام عارف نے قاہرہ کا دورہ کیا اور صدر ناصر سے سید قطب کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ صدر ناصر نے جو عبدالسلام عارف مرحوم کے ساتھ خوش گوار تعلقات کے قیام کے متمنی تھے اس درخواست کے جواب میں سید قطب کو رہا کر دیا[۱] مگر اس رہائی سے عملاً کوئی فرق نہ پیدا ہوا کیونکہ وہ برابر پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ اور انھیں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہ تھی۔

## دوبارہ گرفتاری اور سزا

اس مقید آزادی کو ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ سید قطب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ان پر الزام یہ تھا کہ وہ طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف انھیں بلکہ ان کے بھائی محمد قطب اور ان کی ہمشیرگان حمیدہ قطب اور امینہ قطب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کثیر تعداد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی رپورٹ کے مطابق گرفتار شدگان کی تعداد بیس ہزار سے تجاوز کر گئی[۲]

---

[۱] یہ روایت خلیل حامدی صاحب نے مصر اور کویت کے ثقہ لوگوں سے سنی ہے۔ کسی سرکاری دستاویز یا اخباری بیان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

[۲] ڈیلی ٹیلیگراف ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء۔

## تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے

اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو فوجی ٹریبونل کی طرف سے موت کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان سزاؤں پر پوری دنیا کے اندر شدید ردِ عمل ہوا۔ دینی رہنماؤں، سیاسی شخصیتوں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں اور اخبارات و رسائل کی طرف سے سزاؤں میں تبدیلی کی درخواست کی گئی۔ مگر ان کی شنوائی نہ ہو سکی اور بالآخر ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کی صبح کو یہ سزائیں نافذ کر دی گئیں۔ اور یہ بے نظیر شخصیت جو مصر اور عرب دنیا کے الحاد پرست اور لادین عناصر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ "اپنے رب سے راضیاً مرضیاً" جا ملی۔

(ماخوذ از جادۂ و منزل)

# اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل

ترجمہ

## الاسلام و مشکلات الحضارۃ


مصنف : ——— سیّد قطب شہیدؒ

مترجم : ——— ساجد الرحمٰن صدیقی



احباب پبلی کیشنز ۴۳ اے ریٹی گن روڈ لاہور